رشحاتِ قلم

مولانا مفتی محمد ساجد کھجناوری
استاذ جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ

ناشر
ادارۂ اسلامیات
عیدگاہ کالونی، بھگوان پور، اتراکھنڈ

بزمِ رفتگاں

رشحاتِ قلم

محمد ساجد کھجناوری

مدرس جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ

ناشر

ادارہ اسلامیات بھگوان پور، اتراکھنڈ

نام کتاب : بزم رفتگاں

رشحاتِ قلم : مولانا مفتی محمد ساجد کھجناوری

استاذ جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ سہارنپور

رابطہ نمبر : 09761645908

صفحات : 248

قیمت : 250

پہلا ایڈیشن : اکتوبر 2015ء

تزئین : مولانا فہیم احمد قاسمی سیتا مڑھی بنگلور

ناشر : ادارہ اسلامیات تحصیل بھگوان پور روڈ کی اترا کھنڈ

ملنے کے پتے

● اتحاد بکڈپو دیوبند ● دار الکتاب دیوبند

● دار الکتب الاسلامیہ گنگوہ ● مکتبہ امداد الغرباء محلہ مفتی سہارنپور

● مکتبہ رحیمی دار العلوم محمدیہ گنگونڈنا ہلی بنگلور

● دار العلوم معاذ بن جبل مخدوم پورہ گلبرگہ

● جامعہ اسلامیہ 451/15 سوہنا چوک جامع مسجد گڑگاؤں

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

میر فتح علی شیداؔ

☆ بقیۃ السلف اور ممتاز ماہر تعلیم حضرت مولانا قاری شریف احمد گنگوہیؒ کے نام، جن کا روشن کردہ چراغ ''جامعہ اشرف العلوم رشیدی'' تیز وتند آندھیوں کے باوصف تعلیم وتربیت کی شمع فروزاں کئے ہوئے ہے۔

☆ تلمیذ شیخ الہند اور کاروان اہلِ دل کے قافلہ سالار حضرت مولانا الشاہ سید عبدالعزیزؒ کھجناوری کے نام، جن کی روح وروحانیت اور بابرکت شخصیت کے طفیل کھجناور نام کی دس ہزار سے زائد نفوس پر مشتمل یہ قدیم خالص مسلم بستی علماء امت کی منظورِ نگاہ قرار پائی۔ نیز ان کے ورودِ مسعود سے شرف یاب ہے۔

☆ مشفق والدین اور ان جملہ اساتذۂ ذیشان کے نام جو اس خاکسار کیلئے خضر راہ کی حیثیت رکھتے ہیں، لاریب کہ ان کی دعائے نیم شبی اور آہ سحرگاہی ہی اس ناچیز کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔

آئینۂ افکار

فہرست مضامین

پیش گفتار

پیش نظر کتاب ''بزم رفتگاں'' دراصل ان تعزیتی وتاثراتی مضامین کا دلآویز انتخاب ہے جو اس خاکسار نے گذشتہ دہائیوں کے دوران وفات پانے والے اصحاب فضل وکمال اور نامی گرامی ہستیوں کے تذکرے وتعارف اور افادی پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر تحریر کیے تھے۔ بعدازاں وہ مقتدر رسائل واخبارات میں چھپ کر قدر کی نگاہوں سے دیکھے اور پڑھے بھی گئے۔ یہ کل اکتالیس مضامین قافلۂ علم و کمال، ارباب دین ودانش اور اہل فکر وبصیرت کے جھرمٹ میں شامل ان چالیس شخصیتوں کو عقیدت وچاہت کا خراج ہے جو کردار وعمل کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ وہ جب تک بقید حیات رہے اپنے دم فیض سے قلم وکتاب، روح وروحانیت اور اصلاح وتربیت کے چمن آباد کرتے رہے۔ سالکین ومسترشدین کی دستگیری فرماتے رہے اور تشنہ لبوں کو مے نوشی کے آداب سکھلاتے رہے۔ انسانی قافلے سے بچھڑے تو اپنی حیات طیبہ کے انمٹ نقوش چھوڑ گئے جن سے جہد حیات میں روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ ان کی رخصت پذیری نے ہر کسی کو شدت سے یہ احساس دلایا کہ وہ سراپا خیر وبرکت تھے۔ صلاح وصالحیت کے نمونے تھے۔ ہدایت کے چراغ تھے، اعتبار زندگی تھے۔ روشنی کے نقیب اور تیرگی کے حریف تھے۔ وہ ہزاروں کے مجمع

میں بھی منفرد شناخت کے حامل تھے۔ بلکہ ان کے ملفوظات ارشادات، فرمودات، مناقشات اور آئیڈیالوجیات کاروانِ حیات کو دارین کی حقیقی مسرتوں سے ہم عناں کرنے میں مفید و مددگار رہیں۔

لاریب سیرت و سوانح کے یہی وہ کردار ہیں جن سے انسانی فلاح و بہبود کو انرجی ملتی ہے، عمل صالح اور نفع رسانی کا جذبہ پروان چڑھتا ہے تب جاکر یہ حضرت انسان حقیقی عظمتوں کا طواف کرتا ہے اور مسرت و شادمانی اس کیلئے قرۃ العین ثابت ہوتی ہے۔ خود زبان نبوت نے پس مرگ شخصیتوں کے محاسن و کمالات کے اظہار پر مہر تصدیق ثبت کی ہے، یہ احسان شناسی کا تقاضہ بھی ہے کہ ان کے افکار و خدمات سے پس آئندگان کو متعارف کرا کر کارگاہ حیات میں پیش قدمی کی ترغیب دی جائے، بس یہی صالح جذبہ خاکسار کو مرحومین کے تذکرۂ خیر قلم بند کرنے کی اپیل کرتا رہا ہے، اپنے بزرگوں کی سوانح عمریاں پڑھنے اور ان سے اکتساب فیض کا چسکا احقر کو مکتبی زندگی سے لگ گیا تھا جو گردش شام و سحر کے ساتھ بڑھتا ہی جاتا ہے بس اللہ علیم و خبیر ہی جانتا ہے کہ اس موضوع پر کتنے صفحات پڑھ ڈالے۔

مذکورہ فی الکتاب شخصیات میں چند ممتاز اکابر کے علاوہ بعض وہ نام ور ہستیاں بھی ہیں جنہیں زبانی فاصلوں کے سبب احقر دیکھنے اور سننے سے محروم رہا لیکن ان کے آثار و معارف سے استفادہ اور اہل قلم کی فرمائش پر بہر حال انہیں بھی زیب داستان بنانے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ باقی مضامین مشاہدات و تجربات کی روشنی میں عام فہم اور رواں دواں اسلوب میں قلم بند کئے ہیں۔ فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیری علیہ الرحمۃ پر خاکسار نے متعدد مضامین لکھے تھے لیکن زیر نظر

کتاب میں صرف دو مضامین کو جگہ دی ہے ایک تو ان کے سانحۂ وفات پر قلم برداشتہ لکھا ہوا جبکہ دوسرا مرحوم کے اسلوب نگارش کے جائزہ پر مشتمل ہے یقینا قارئین اس ادبی مضمون سے حظ حاصل کرنے میں بھی دریغ نہیں کریں گے۔ مضامین کی تقدیم و تاخیر میں سنین وفات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ البتہ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

یہ بھی عیاں رہے کہ زیر تذکرہ کتاب سوانحی سلسلہ کی ابتدائی کوشش ہے اصل کام باقی ہے۔ جو اللہ کی توفیق واعانت کے بغیر ممکن نہیں، میرے بہت سارے اکابر علماء مشائخ عظام اساتذۂ ذی شان اور محسنین ہیں جن کے الطاف وعنایات سے خاکسار کی گردن زیر بار ہے۔ ان شاء اللہ اگر موقع ملا تو ان پرکھوں کی یادوں کے چراغ بھی روشن کرونگا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اپنے محسنین کا تشکر و تذکرہ کئے بغیر آگے بڑھ جاؤں، ایک طویل فہرست ہے لیکن میں صرف لفظوں سے رسمی شکریہ ادا کر کے ان کرم فرماؤں کی ناقدری کا ارتکاب کرنا نہیں چاہتا اللہ پاک ان سبھوں کو اپنے شایان شان اجر جزیل عطا فرمائے پھر بھی چند نام ذہن کی اسکرین پر شدت سے ابھر رہے ہیں۔ مخدوم گرامی مرتبت حضرت مولانا مفتی ابو القاسم نعمانی مدظلہ محدث و مہتمم دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ صاحب مدظلہ محدث و ناظم جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ کی خدمت میں ہدیہ تشکر کہ ان کی بزرگانہ توجہات میرے لئے مینارۂ نور رہیں۔

محترم عالی مرتبت جناب مولانا ندیم الواجدی زید مجدہم مدیر اعلیٰ ماہنامہ

ترجمان دیوبند وشہرت پذیر خاکہ نویس جناب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر زید مجدہ استاذ دارالعلوم وقف دیوبند کا بھی قلبی شکریہ کہ اول الذکر نے اپنے کثیر الاشاعت ماہنامے کے صفحات پر اس ناچیز کے ذوق نگارش کی آب یاری کے کتنے ہی مواقع فراہم کئے، جبکہ ثانی الذکر نے قلمی زندگی میں اپنی گرانقدر آراء سے ہمیشہ شادکام کیا ہے زیر تذکرہ کتاب پر بھی ان اصحاب قلم نے دقیع آراء لکھ کر اس کے حسن کو دوآتشہ کر دیا ہے۔

اردو زبان وادب کے سحر طراز نثر نگار اور معروف نقاد جناب حقانی القاسمی کی خدمت میں بھی شکر وسپاس کے ازحد تحفے کہ انہوں نے فاضلانہ مقدمہ تحریر کر کے کتاب کو سند قبولیت کا جواز فراہم کر دیا ہے۔

برادران گرامی مولانا محمد عثمان ندوی ناظم ادارہ اسلامیات بھگوان پور، مولانا مفتی سلیم احمد قاسمی بنارسی مؤسس جامعہ اسلامیہ گڈگاؤں اور مولانا عبدالرزاق قاسمی بانی و مدیر دارالعلوم معاذ ابن جبل مخدوم پورہ گلبرگہ کا بھی نہایت ممنون ہوں کہ ان زندہ دل اصحاب نے کتاب کی اشاعت کا بار بار تقاضہ کر کے حسب بساط اپنے تعاون سے بھی نوازا۔

محترم مولانا محمد اصغر قاسمی مانک مئوی، ڈاکٹر حکیم محمد فاروق اعظم حبان قاسمی، مفتی خلیل الرحمن برنی، مولانا فاروق اعظم عاجزؔ، مولانا محمد عرفان قاسمی، مولانا محمد ابرار ندوی، مولانا فتح محمد ندوی، مولانا محمد ایوب مظاہری، مولانا محمد راحت مظاہری اور مولانا عبدالواجد رشیدی ندوی کے لئے بھی دیرینہ جذبات کہ یہ جملہ محبین ناچیز کی ہر خوشی میں اپنی شرکت کو ضروری سمجھتے ہیں جو بے شک وشبہ میرے لئے سعادت کی

بات ہے حق جل مجدہ ان کے گلشن حیات کو بھی ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھے نیز ادنی سی اس قلمی کاوش کو حسن قبول سے نواز کر راقم آثم کو اپنے مقبول بندوں میں شامل فرمالیں ورنہ اپنا تو حال یہ ہے کہ ؎

احب الصالحین ولست منهم　　لعل الله یرزقنی صلاحا

محمد ساجد کھجناوری

مدیر ماہنامہ ''صدائے حق'' گنگوہ

مدرس جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ

حرفِ تقدیم

جناب حقانی القاسمی نئی دہلی

دارالعلوم دیوبند کے دیواری جریدے سے جس نسل نے جنم لیا اس میں کئی ناموں نے علمی اور ادبی دنیا میں اپنی الگ پہچان بنائی ہے۔ بہت سے افراد صحافت میں نہ صرف سرگرم ہیں بلکہ مستحکم موجودگی کا ثبوت بھی دے رہے ہیں۔ یہ فیضان ہے دیواری مجلہ کی روایت کا جو طلبا کی تحریری تربیت اور تمرین کا ایک بہترین پلیٹ فارم ہے۔ طلبا اپنے داخلی جذبات، احساسات اور تخلیقیت کے اظہار کے لئے دیواری جریدہ کو ایک بہتر ذریعہ سمجھتے ہیں۔ امکانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور داخلی تخلیقی قوت کو مہمیز کرنے میں وال میگزین کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ یہی دیواری جریدے ہیں جو طلبا کے ترابط اور تعامل کا موثر وسیلہ ہونے کے ساتھ طلبا کی عمومی آگہی اور متنوع معلومات کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں۔ جداری مجلات کے باب میں دارالعلوم دیوبند کا انفراد و اختصاص ہے کہ وہاں ہندوستان کی مختلف ریاستوں اور اضلاع کی انجمنیں قائم ہیں اور ان کے زیراہتمام دیواری مجلّات شائع کئے جاتے ہیں اور یہ ملٹی لنگول (کثیر لسانی) ہوتے ہیں اردو، اڑیہ، آسامی، بنگلہ، عربی اور دیگر زبانوں میں نکلتے ہیں۔ اس طرح دارالعلوم کی دیواریں لسانی رنگارنگی کا خوبصورت نمونہ پیش کرتی ہیں اور مختلف ثقافتی مظاہر سے روبرو کراتی ہیں۔ دیوبند کے علاوہ شاید ہی کسی اور علمی یا عصری ادارہ سے اس طرح کے متنوع اور کثیر لسانی جرائد و رسائل شائع ہوتے ہوں۔ اسی دیواری جریدے نے علمی دنیا کو بہت سے مصنفین

اور ارباب قلم دیے ہیں۔

ساجد کھجناوری کے تحریری سفر کا آغاز بھی اسی دیواری جریدے سے ہوا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں وہ طلباء سہارن پور و دیوبند کی انجمن مجلس علمیہ قاسمیہ کے ترجمان ''القاسم'' کی ادارت کے فرائض انجام دے چکے ہیں اور یہیں کی مشق و ممارست نے ان کا رشتہ اردو کے ان جرائد سے جوڑ دیا ہے جن سے تحریر کو دیوار سے باہر کی دنیا میں ایک بڑا حلقہ میسر ہوتا ہے اور قاری کے ذہن میں لکھنے والے کی ایک پہچان بھی بنتی ہے۔ اس کی شناخت کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ ساجد کھجناوری نے مختصر عرصہ میں اپنی تحریروں کے ذریعہ علمی اور دینی حلقہ میں اپنا اعتبار قائم کیا ہے۔ مختلف اخبارات میں ان کی تحریروں سے ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔ ان ملاقاتوں سے ذہن میں ایک خوشگوار تاثر قائم ہوا اور خوشی ہوئی کہ دیوبند کے فیض یافتگان اپنی تحریروں سے صرف خلق خدا کو فیض نہیں پہنچا رہے ہیں بلکہ زبان و ادب کی ثروت میں بھی گراں قدر اضافہ کر رہے ہیں۔ وہ اصطلاحات اور تراکیب جو کبھی اردو کلچر کا حصہ تھیں اور وہ الفاظ جن سے اردو کی شوکت و جزالت قائم تھی، ان کی بازیافت کی شکل نکلی اور متروک الفاظ کو نئی زندگی ملی۔ عربی اور فارسی کے تہذیبی الفاظ سے رشتہ جوڑنے کی وجہ سے ان تحریروں کی وقعت بڑھ جاتی ہے جن میں فکریات کے ساتھ لفظیات کا بھی بیش بہا خزانہ ہو۔ دینی مدارس کے فارغین کی تحریروں میں یہ خوبیاں ہیں۔ ان کی تحریریں code switching کی بہترین مثال ہیں۔

ساجد کھجناوری متحرک فعال خردمند اور بیدار مغز ہیں۔ مطالعاتی دائرہ بھی وسیع ہے اور فکر و نظر کے رقبہ کو وسعت آشنا کرنے کے لئے کوشاں بھی رہتے ہیں۔ انہوں نے

ذہن میں جمود کو راہ نہیں دی۔ متداول علوم کے ساتھ معاصر افکار و نظریات سے بھی آگاہ ہیں۔ سیاست اور سماج کے سروکاروں سے واقفیت ہے۔ مختلف مجلّات (صدائے حق گنگوہ، نقوش اسلام مظفر آباد، متاعِ کارواں) کی ادارت نے الگ الگ نثری اسالیب سے روبرو ہونے اور ان کی تحریر کو جلال و جمال عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

مفتی ساجد صالح ذہن و فکر کے حامل ہیں اس لئے ماینفع الناس افکار کو ہی اپنے ذہن میں جگہ دی ہے۔ بزرگوں کی روشن تحریروں سے ان کا رشتہ ہے اس لئے ان کے یہاں حکمت و دانش کی وہ روایت فروزاں ہے جس نے آدابِ زندگی سکھائے ہیں۔ سماج کو روحانی اخلاقی اقدار سے آراستہ کیا ہے۔ بزرگانِ علم و فن ان کے ذہنی نصاب کا حصہ ہیں اس لئے ان کی بیشتر تحریروں کا محور و مرکز یہی بلند قامت شخصیات ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا انظر شاہ کشمیری، مولانا ازہر شاہ قیصر، مولانا اعجاز اعظمی، مفتی ظفیر الدین مفتاحی، مولانا نصیر احمد خاں، مولانا خورشید عالم دیوبندی، قاری شریف احمد گنگوہی، علامہ عثمان غنی، مولانا اصغر، مولانا عبدالکریم پاریکھ، مولانا اسعد مدنی، مولانا مرغوب الرحمن، مولانا زبیر الحسن، مولانا رئیس الدین، مولانا محمد عبداللہ الحسنی، مولانا محمد کامل .... یہ وہ گنج ہائے گراں مایہ ہیں جن کے بارے میں پڑھ کر ناصر کاظمی مرحوم کا یہ شعر یاد آتا ہے:

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ   لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ

یہ ہمارے اکابر ہیں جن کی زندگی اور خدمات سے ہمیں تحریک ملتی ہے۔ انہی متاثر کن شخصیات کی جد و جہد اور مساعی سے ہی ہمارے ذہن کے تاریک منطقے روشن

ہوئے ہیں۔ علمی اور دینی معاشرے پر ان کے بڑے احسانات ہیں مگر تغیرات زمانہ کے ساتھ ساتھ ہمارا ذہنی وجود بھی تبدیلیوں سے گزرتا رہتا ہے اور اس تبدیلی کے نتیجہ میں بہت سی شخصیات کے روشن کارنامے ہمارے ذہن سے محو ہوتے جارہے ہیں۔ صارفیت نے بھی ہمارا ذہنی رشتہ روحانیت سے توڑ دیا ہے۔

مفتی ساجد کھجناوری نے مادی اور صارفی معاشرت میں ہمارے ذہنی سلسلے کو اس رود روحانیت سے جوڑنے کی کوشش کی ہے جس کے بغیر معرفت ذات ممکن نہیں ہے ۔انسان کو اپنے وجود کی شناخت کے لئے ان اسلاف اور اکابر کے افکار سے آگہی ضروری ہے۔

مفتی ساجد کی کتاب ''بزم رفتگاں'' میں خیالات کی کہکشاں ہے جس میں خوشبو جیسے لوگوں کی زندگی کے شب وروز اور ان کے شبنمی کردار سے روبرو ہونے کا موقع ملتا ہے۔ یہ اس جہان روحانیت کی سیر کراتی ہے جہاں سے فکر کو نئی حرارت' احساس کو اشارت اور اظہار کو نئی عبارت ملتی ہے۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ فراموش کاری کے اس عہد میں ساجد کھجناوری نے اپنے اسلاف کو یاد رکھنے کا نہ صرف اہتمام کیا بلکہ ان کے روشن نقوش حیات وافکار سے اس نسل کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے جس میں سے اکثریت ان اکابر کے کارناموں سے مکمل واقفیت نہیں رکھتی اور یہی نا آشنائی ہماری نسل کے ذہن اور زبان کا زائچہ بگاڑ رہی ہے۔

''بزم رفتگاں' ان بزرگوں کی صرف سوانح حیات نہیں ہے بلکہ ہماری علمی اور تمدنی تاریخ بھی ہے۔ ماضی میں وفیات نگاری کا سلسلہ اسی علمی اور تہذیبی تاریخ کے تحفظ کی

غرض سے شروع کیا گیا تھا۔ شمس الدین ابوالعباس احمد بن محمد ابن خلکان کی وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان اس کی ایک روشن مثال ہے جس کی علمی افادیت کے مدنظر انگریزی میں william mc guckin de slane نے 2700 صفحات پر مشتمل ترجمہ کیا ہے ۔ سید سلیمان ندوی کی ''یاد رفتگاں'' ماہر القادری کی ''یاد رفتگاں'' سید صباح الدین عبدالرحمن کی ''بزم رفتگاں'' مولانا تقی عثمانی کی ''نقوش رفتگاں'' اور مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کی ''نئے پرانے چراغ'' اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں ۔مفتی ساجد نے ''بزم رفتگاں'' میں اخبار اخیار کی اسی شمع کو روشن کیا ہے۔

مفتی ساجد کھجناوری عمدہ ادبی ذوق رکھتے ہیں اس لئے ان کے یہاں خشکی یا یبوست نہیں ہے۔تحریر میں علمیت کے ساتھ ادبی شگفتگی بھی ہے۔علمیت اور ادبیت کے امتزاج نے ان کی تحریر کو ایک خاص صورت عطا کی ہے اور یہی صورت کسی کے اختصاص اور انفراد کی نشاندہی کرتی ہے۔دیوبند کی تربیت یافتہ نسل میں مفتی ساجد اپنی تحریروں اور تبصروں کے ذریعے اپنی پہچان بنا چکے ہیں ۔خدا سے دعا ہے کہ اس پہچان کو مزید استحکام نصیب ہو۔

حقانی القاسمی ، نئی دہلی

cell: 9891726444
email : haqqanialqasmi@gmail.com

حرفِ دُعاء

حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ صاحب مدظلہم

محدث و مہتمم جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ

الحمد لاهله والصلوٰة علی نبيه اما بعد!

کسی اہل دل کا مشہور مقولہ ہے ”عند ذکر الصالحين تنزل الرحمة“ کہ تذکرۂ صالحین نزول رحمت کا باعث ہوتا ہے، واقعی یہ حقیقت بھی ہے کہ خدا مستوں، عارفین باللہ اور خاصانِ خدا کے سوانحات، ملفوظات، ارشادات طیبات اور احوال وافکار میں سکون دل کا خاصا بیش قیمت سرمایہ پنہاں ہوتا ہے، جس کے علم ومطالعہ اور کحل البصر بنا لینے سے روح کو تازگی، فکر کو پاکیزگی اور خیالات کو بلندی حاصل ہوتی ہے، مثالی زندگی گذارنے والے یہ ارباب صدق وصفا جس طرح اپنے حین حیات ہی پژمردہ قلوب کو صیقل کرنے، بیمار ذہنوں کو نسخۂ شفاء فراہم کرنے اور اپنی صحبت کیمیا سے ہزاروں بندگان خدا کی کشتیٔ ویراں کو ساحل مراد تک پہنچادینے کا بابرکت عمل انجام دیتے ہیں اسی طرح اس بے ثبات دنیا سے پردہ کناں ہونے کے بعد بھی ایسے نشاناتِ قدم چھوڑ جاتے ہیں جن سے پس آئندگاں کو روشنی ملتی ہے، اور وہ اپنے ان پرکھوں کی صالح اور پاکیزہ عملی زندگی سے دنیا وآخرت کی بھلائی کا بہت کچھ سامان اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں، یہی وجہ ہے

کہ مثالی لوگوں کے سوانح وتذکرے قلم بند کرنے کا اہتمام قدیم زمانہ سے جاری وساری ہے، دنیا کی مختلف زبانوں میں تذکرہ نگاری کے شہ پارے بکھرے پڑے ہیں، عربی زبان میں تو اس موضوع پر جتنا کام ہوا ہے شاید ہی کسی دوسری زبان کو اس کی ہم سری کا دعویٰ ہو، بے شمار کتابیں اہل علم وقلم نے زیر تذکرہ موضوع پر نہایت حزم واحتیاط اور فنی ممارست کے ساتھ تصنیف کی ہیں، شہرۂ آفاق تذکرہ نویس ابونعیم کی ''حلیۃ الاولیاء'' نام ور نقاد اور ماہر حدیث عبدالرحمن ابن الجوزی کی ''صفوۃ الصفوۃ'' علامہ شمس الدین ذہبی کی ''سیر اعلام النبلاء'' شیخ عبدالرحمن جامی کی ''نفحات الانس لحضرات القدس'' اور ابن خلکان کی وفیات الاعیان کو صرف نمونہ کے طور پر ہی پیش کیا جاسکتا ہے، یقیناً یہ اعلام امت کے وہ قلمی معرکے ہیں جن کے پڑھنے اور سننے سے باذوق طبیعتیں کبھی سیر نہیں ہوتیں۔

اردو میں بھی اس بابت خاصا ذخیرہ موجود ہے بلکہ اردو زبان وادب میں سند کا درجہ رکھنے والے متعدد اصحاب قلم نے خود اس حوالہ سے نمایاں کام کیا ہے، جس کے اعادہ کی یہاں چنداں ضرورت نہیں، راقم الحروف نے بھی اپنے وطن گنگوہ اور اس سے وابستہ دینی علمی اور عبقری شخصیتوں کا تعارف بنام ''تذکرہ اکابر گنگوہ'' دو جلدوں میں قلم بند کیا تھا جسے بحمداللہ علم ومطالعہ کے رسیا حضرات نے بنظر استحسان دیکھا، حال آں کہ یہ اپنی سی بس ایک کوشش تھی اللہ پاک ذخیرۂ آخرت بنائے۔

الغرض جانے والوں کو یاد رکھنا اور ان کے محاسن وکمالات کا تذکرہ کرنا ایک مفید عمل ہے، بالخصوص جبکہ رفتگاں اپنے امتیازات اور علمی وعملی شناخت کے حامل رہے ہوں تو ان کی یادوں کے چراغ روشن رکھنا مزید توجہ کا متقاضی ہوتا ہے، اس سے احسان شناسی کا فرض بھی ادا ہوتا ہے اور نفع رسانی کا جذبہ بھی پروان چڑھتا ہے، نیز اس لئے بھی کہ نسل نوکو ان حضرات کے تذکروں سے جہد حیات میں قوت وعمل کی تحریک ملتی ہے۔

مقام مسرت ہے کہ عزیز القدر مولانا مفتی محمد ساجد کھجناوری سلمہ اللہ تعالی نے بھی اسی صالح جذبہ سے سرشار ہوکر مشائخ اہل اللہ اور کاروان دین ودانش کا پیش نظر یہ حسین گلدستہ ''بزم رفتگاں'' ترتیب دیدیا ہے، مولانا محترم کے یہ مضامین چالیس سے زائد شخصیتوں کے تذکرہ اور تعارف پر مشتمل ہیں جوان کے حادثۂ وفات پر قلم برداشتہ لکھے گئے تھے، متعدد مواقع پر تحریر کئے گئے یہ مضامین مختلف رسائل، اخبارات اور جرائد کے فائلوں میں بکھرے پڑے تھے، اب موصوف نے یکجا کر کے انہیں نئی زندگی دیدی ہے اور انہیں اوراق پریشاں ہونے سے بچالیا ہے، کوئی شبہ نہیں کہ فاضل گرامی مفتی محمد ساجد کھجناوری تحریر وانشاء کا ستھرا ذوق رکھنے والے ممتاز لوگوں میں شمار ہوتے ہیں، تعلیم وتعلم کی رسمی فراغت کے بعد وہ یہاں جامعہ اشرف العلوم رشیدی میں مدرس ہوکر فروکش ہوئے تو ان کی صلاحیتوں کے پرت کھل کر سامنے آئے۔ اب وہ فقہ وادب عربی کی چھوٹی بڑی کتابیں بھی پڑھاتے ہیں اور جامعہ کے صحافتی ترجمان ماہنامہ ''صدائے حق'' کے ادارتی امور بھی دیکھتے ہیں، انہیں لکھنے پڑھنے کا فطری ذوق ہے، وہ رواں دواں اور پرکشش زبان میں لکھتے ہیں، غیر مانوس اور مدرسی تعبیرات سے وہ اپنی تحریر کو بوجھل نہیں بناتے، اسی لئے ان کی تحریروں میں بانکپن وارفتگی اور حلاوت کا مزہ ملتا ہے۔ مجھے ان کے قلم وتحریر کی پختگی پر بھرپور اعتماد ہے۔ اسی لئے بسا اوقات راقم الحروف بھی ان سے قلمی تعاون لینے سے دریغ نہیں کرتا۔ وہ بہت سلیقہ سے تحریری مسئلہ کا مداوا کرنا جانتے ہیں، اب ان کی یہ تازہ بتازہ تصنیف زیور طباعت سے آراستہ ہورہی ہے تو میری خوشی بھی اضعافا مضاعفہ ہے، اللہ پاک سند قبول سے سرفراز فرمائے اور مؤلف کیلئے سعادت دارین مقدر فرمائے آمین۔

حرفِ تحسین

حضرت مولانا ندیم الواجدی

مدیر ماہنامہ ''ترجمان

دیوبند'' دیوبند

گذشتہ چند برسوں میں دارالعلوم دیوبند کے جن فاضلین نے قلم کے میدان میں اپنے جوہر دکھلائے ہیں، اور لکھنے لکھانے کے حوالے سے اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے ان میں ایک اہم نام مولانا محمد ساجد قاسمی کھجناوری کا ہے، لکھنے کا شوق انھیں زمانہ طالب علمی ہی سے رہا ہے، طبیعت میں سنجیدگی، ٹھہراؤ اور متانت ہے، گفتگو میں شائستگی اور لطافت ہے، یہ اوصاف ان کی تحریروں میں بھی جھلکتے ہیں، ان کی خوش قسمتی ہے کہ فراغت کے بعد انھیں درس وتدریس کے ساتھ ساتھ قرطاس وقلم سے رشتہ باقی رکھنے بلکہ استوار کرنے کا موقع بھی میسر آگیا اور وہ بھی دیوبند سے قریب گنگوہ کی ایک قدیم درسگاہ اشرف العلوم میں، اب مولانا ساجد صاحب درس نظامی کی کتابیں بھی پڑھا رہے ہیں اور اس مدرسے سے شائع ہونے والا ماہانہ رسالے کے ذریعہ اپنے ذوق نگارش کی آب یاری کرنے میں بھی مصروف ہیں، اس رسالے ''صدائے حق'' کی ادارتی تحریریں ان ہی کے فکروقلم کے نتیجے

میں وجود پذیر ہوتی ہیں، ہمارے ماہ نامہ ''ترجمان دیوبند'' کے صفحات پر بھی ان کے متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

مولانا ساجد کھجناوری نے ہر طرح کے مضامین لکھے ہیں، دینی بھی، علمی بھی، اصلاحی اور سیاسی بھی، مگر مرحوم شخصیات پر ان کی تحریروں میں جو بانکپن اور وارفتگی پائی جاتی ہے اس کی بات ہی کچھ اور ہے، شخصیت نگاری کے فن سے جو لوگ واقف ہیں وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ کسی شخصیت پر خاص طور پر کسی ایسی شخصیت پر لکھنا جو زندگی کے کارواں سے بچھڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہو، اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا، اس کے تمام امتیازات کو سمیٹنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے، یہ بھی ایک طرح کی کوہ کنی ہے، فرہاد نے یہ کام تیشے سے کیا تھا اور قلم کار کوہ کنی کا یہ مشکل کام قلم سے انجام دیتا ہے، مولانا ساجد کھجناوری بھی کسی کوہ کن سے کم نہیں ہیں، وہ محنت سے لکھتے ہیں، اسی لیے ان کے مضامین میں قاری کو دلچسپی کا بہت کچھ سامان مل جاتا ہے، ان کی تحریروں میں سلاست اور روانی بھی ہے جو پڑھنے والوں کو لکھنے والے کے ساتھ مربوط رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں شروع سے آخر تک ایک ہی نشست میں پڑھی جاتی ہیں، کسی صاحب قلم کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی اور اطمینان کی کوئی بات دوسری نہیں ہو سکتی کہ اس کی تحریر کسی اکتاہٹ کے بغیر دل چسپی کے ساتھ پڑھی جائے۔

میرے سامنے اس وقت مولانا کھجناوری کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مرحومین پر لکھے ہیں، ان مضامین میں خود صاحب مضامین کے اساتذہ بھی ہیں، ان کے بزرگ بھی ہیں، اساطینِ علم وفضل بھی ہیں، ملّی اور ملکی رہ نما بھی ہیں، تقریباً تمام شخصیتیں وہ ہیں جن سے اُن کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رہا ہے، بعض سے انھوں نے بھرپور استفادہ کیا ہے، بعض ایسے بھی ہیں جن کی محض زیارت کی ہے، یا جن سے صرف ملاقات کا شرف

حاصل کیا ہے، ظاہر ہے جن لوگوں سے ان کا تعلق قریب کا ہے ان کے بارے میں تو ان کو بھرپور انداز میں لکھنا ہی تھا، حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ جن لوگوں کو انھوں نے صرف دیکھا ہے یا جن کو صرف پڑھا یا سنا ہے ان کے متعلق بھی ان کا اَشہبِ قلم خوب رواں دواں ہے، مولانا کے مضامین پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مشاہدے میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی، پھر جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں یا دیکھتے ہیں اس کو سلیقے سے الفاظ کے موتیوں میں پرو کر ایک خوب صورت شکل دینے کی صلاحیت بھی ان کے اندر بدرجۂ اتم موجود ہے۔

پیشِ نظر کتاب قولِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم: اذکروا محاسن موتاکم (تم اپنے مرنے والوں کی اچھائیاں بیان کیا کرو) کی عملی تفسیر وتشریح ہے، جانے والوں کو یاد کرنا بشری تقاضا بھی ہے اور شریعت کا حکم بھی، بشری تقاضا تو اس لیے کہ اپنے عزیزوں، اپنے پیاروں، اپنے محسنوں اور اپنی ذات سے کسی بھی نوعیت کا تعلق رکھنے والوں کو یاد کرنا دل کو سکون کی ٹھنڈی پھواروں سے شرابور رکھتا ہے، اور شرعی حکم کی مصلحت وحکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ جانے والوں نے اپنی زندگی کے ماہ وسال میں جو کچھ اچھا کیا اسے نمونۂ عمل بنایا جائے اور جو بُرا کیا اُسے نظر انداز کردیا جائے، جس طرح کسی شخص کے انتقال کے بعد ہم زبان سے اس کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہوتے ہیں اسی طرح ہمارے قلم کو بھی ان کی تعریف کرنے میں بخیل نہ ہونا چاہیے، الحمد للہ ہر دور میں اصحابِ قلم نے اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اپنے مرحومین کو قلم کا خراج بھی پیش کیا ہے، عربی کی طرح اُردو کا دامن بھی اس طرح کی نگارشات سے خالی نہیں ہے، ہمارے حلقوں میں بھی اس نوعیت کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، امید ہے یہ کتاب بھی اس نوع کی دوسری

کتابوں کی طرح اہم اضافہ ثابت ہوگی۔

مولانا ساجد کھجناوری نے جن شخصیتوں پر قلم اٹھایا ہے ان میں سے زیادہ تر اپنے اپنے میدان عمل میں کسی نہ کسی امتیازی شان کے مالک رہے ہیں، رات دن موت وحیات کی کش مکش جاری ہے، لوگ روز مرتے ہیں اور کچھ دوسرے اُن کی جگہ کارزار حیات میں قدم رکھتے ہیں، ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ملک وملت اور دین وادب کے حوالے سے کچھ اہم کام انجام دے کر رخصت ہوتے ہیں، اُن کی خدمات ان ہی کے ساتھ قبر میں دفن ہو جائیں اگر بعد میں آنے والے زبان وقلم سے ان کی خدمات کو زندگی کا سامان فراہم نہ کریں، ایسے تمام لکھنے والے یقینا اسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے اجر وثواب کے مستحق بھی ہوں گے اور قیامت کے دن مرحومین کے سامنے سرخ رو بھی ہوں گے، ان کا یہ عمل نسل نو پر کسی احسان سے کم نہیں، اگر لکھنے والے اپنے پیش رؤوں کا ذکر نہ کریں تو بعد والوں کو کیسے پتہ چلے گا کہ جانے والے ان کے لیے کیا کچھ کر گئے ہیں اور ہمیں ان کے چھوڑے ہوئے کام کو کس طرح آگے بڑھانا ہے، جہاں تک مجھے علم ہے مولانا ساجد کھجناوری کی یہ پہلی کتاب ہے، ہمیں یہ امید رکھنی چاہیے کہ مولانا کے ساتھ قلم وقرطاس کا یہ رشتہ ہمیشہ قائم رہے گا، اور ہم سب ان کی قلمی کاوشوں سے اسی طرح مستفید ہوتے رہیں گے۔ ع

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

ندیم الواجدی

مدیر ماہ نامہ ”ترجمان دیوبند“

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف شیریں

حضرت مولانا محمد سلمان بجنوری مدظلہ
استاذ ادب عربی دارالعلوم دیوبند

تذکرہ نگاری، اس دور کے مقبول عام موضوعات میں سے ہے، خاص طور سے مرحومین کے بارے میں ان کی وفات کے قریبی دور میں لکھنے کا رواج تو اس زمانہ میں ایک اخلاقی فرض کی سی حیثیت اختیار کر گیا ہے، پھر امت مسلمہ کو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے یہ ہدایت بھی ملی ہوئی ہے کہ اذکرو محاسن موتکم (اپنے مرحومین کی خوبیوں کا تذکرہ کرو) اس بے مثال نبوی ہدایت پر عمل ہر شخص کیلئے بلاشبہ عظیم سعادت ہے، شاید اسی لئے اپنے اہل قلم علماء نے اس موضوع پر بھی خاصی توجہ کی ہے اور جن حضرات کا تعلق کسی خاص ماہنامہ یا مجلہ سے رہا ہے ان میں سے بہت سے حضرات کی اس قسم کی تحریروں کے مجموعے کتابی شکل میں شائع ہو گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں بطور مثال ''یاد رفتگاں'' حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ۔ ''معاصرین'' ''وفیات ماجدی'' از مولانا عبدالماجد دریابادیؒ۔ ''پرانے چراغ'' از مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ ''یاد رفتگاں'' از ماہر القادری مرحوم۔ ''نقوش رفتگاں'' از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم۔ ''ذکر رفتگاں'' از مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری زید مجدہم۔ ''میرے عہد کے لوگ'' ''جانے پہچانے لوگ'' ''اپنے لوگ'' از مولانا نسیم اختر شاہ قیصر

کے نام تو اسی وقت ذہن میں آ گئے، ان کے علاوہ صاحب طرز ادیب رشید احمد صدیقی مرحوم کی ''گنجہائے گراں مایہ'' اور ''ہم نفسان رفتہ'' کا نام لئے بغیر تو یہ مختصر فہرست بھی ناقص رہے گی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ''چند ہم عصر'' بھی کیسے نظر انداز کی جا سکتی ہے، بہر حال اس موضوع پر اردو ادب میں ایک خاص لائبریری تیار ہے۔

زیر نظر کتاب ''بزم رفتگاں'' بھی اسی لائبریری میں ایک اضافہ ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مذکورہ بالا کتابوں کے برخلاف ایک نوجوان اہل قلم کی صلاحیتوں کا نمونہ ہے۔ عزیز گرامی مولانا محمد ساجد صاحب کھجناوری زید علمہ کی دارالعلوم دیوبند سے فراغت کو ابھی شاید دس سال بھی پورے نہیں ہوئے ہیں، لیکن ماشاء اللہ انہوں نے میدان تحریر میں اپنی پہچان بنانے کیلئے خاصا کام کر لیا ہے، انہوں نے دورِ طالب علمی ہی میں زبان و قلم سے اپنا رشتہ استوار کر لیا تھا، اور اس میدان میں وہ مسلسل محنت کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کو احقر راقم سطور کی مادرِ علمی جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ میں تدریس کے ساتھ ساتھ تحریر کی جولان گاہ میں اپنا جوہر دکھانے کا موقع مل گیا اور اس ادارہ کے ترجمان ماہنامہ ''صدائے حق'' کی ادارت کیلئے قرعۂ فال ان کے نام نکل آیا، اس طرح ان کا اشہب قلم مختلف موضوعات پر اپنی جولانیاں دکھانے لگا، اس دوران انہوں نے متعدد شخصیات پر لکھا جن میں سے بعض کو انہوں نے دیکھا ہے اور بہت سی شخصیات کے بارے میں سنا ہے یا پڑھا ہے، پھر ان پر اظہار خیال کیا اور دونوں قسم کی شخصیات پر ان کے قلم کی روانی یکساں ہے۔ انداز تحریر میں والہانہ پن ہے، تعبیر میں ادبیت ہے، زبان میں سلاست ہے اب وہ اپنے ان مضامین کا مجموعہ ''بزم رفتگاں'' کے نام سے شائع کر

رہے ہیں، راقم سطور عزیز موصوف کو اس ادبی کاوش پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔ احقر کو مزید مسرت اس نسبت سے ہے کہ مولانا محمد ساجد صاحب کی صلاحیتوں کے اظہار کا میدان وہ ادارہ ہے جو احقر کی مادر علمی اور احقر کے نہایت محسن اور پدرانہ شفقتوں کے حامل استاذ محترم، استاذ العلماء حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہ کی یادگار ہے، اسی توسط سے احقر برادر گرامی مرتبت حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ صاحب مدظلہ کو بھی مبارکباد پیش کرتا ہے، اللہ رب العزت مولانا محمد ساجد صاحب کی اس کاوش کو قبول فرمائے اور ان کو مزید علمی و دینی خدمات کی توفیق ارزانی فرمائے آمین، والسلام۔

محمد سلمان عفی عنہ

خادم تدریس دار العلوم دیوبند

۲۴ر جمادی الثانیہ ۱۴۳۶ھ مطابق ۱۴را پریل ۲۰۱۵ء

میری نظر میں

مولانا نسیم اختر شاہ قیصر
استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

جذبات واحساسات کو بھی پھیلنے اور بڑھنے کے لیے راستوں کی تلاش ہوتی ہے اور تلاش کا یہ سفر جب حروف والفاظ کی ترتیب اور ادائیگی پر ختم ہوتا ہے تو کاغذ کے بے جان سینے پر دل کی دھڑکن سنی جاتی، آنسوؤں کی نمی محسوس کی جاسکتی اور عقیدت وتعلق کی ساعتوں کو بولتے دیکھا جاسکتا ہے یہی وہ لمحے ہوتے ہیں جب قلم کی نوک سے قرطاس پر کھینچی گئیں لکیریں اس دنیا سے آشنا کرتی ہیں جہاں قلم کار کی صلاحیتوں کے چراغ جلنے شروع ہوتے ہیں اور گویائی کی قوتیں اپنے وجود کا احساس دلانے میں کامیاب رہتی ہیں، شخصیت نگاری ایک الگ فن ہے اور اس فن میں وہی لوگ باریاب ہو پاتے ہیں جن کا مشاہدہ گہرا اور تجربہ پختہ ہو صرف صاحب قلم ہونے سے اس دیار کی کیفیات کو زیر قلم لانا ممکن نہیں اس کوچے میں وہی مسافران قلم کامیاب ہوتے ہیں جنھیں محسوسات کی دولت حاصل ہے اور جن کی آنکھیں شخصیت کے اندرون چھپی ہوئی ان خوبیوں اور کمالات کو بھی دیکھ لیتی ہیں جن کا ایک عام آدمی احساس نہیں کرپاتا زندگی کے لاتعداد ماہ وسال ساتھ گزارنے والے اور شب وروز قریب رہنے والے وہ نہیں دیکھ پاتے جس کو ایک قلم کار کی نگاہ چند ہی ملاقاتوں میں جان لیتی اور پرکھ لیتی ہے، پھر اگر فن کار حساس ہے تو اس کے لیے یہ منزل آسان اور سہل ہے۔

شخصیات پر لکھنا زمانہ قدیم سے جاری ہے اور دنیا کی بیشتر زبانوں میں افراد واشخاص پر ایسے شہ پارے مل جاتے ہیں جن میں زبان کی چاشنی اور ادائیگی کا حسن قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا ہے، اردو میں بھی تذکروں اور سوانحی باب میں فن پاروں کی کمی نہیں ہے۔ اگر جائزہ لیں اور پھر اس جائزہ کو سپردِ قلم کریں تو بات لمبی اور طویل ہو جائے گی لیکن اتنا کہہ دینا ضروری اور لازمی ہے کہ اردو میں جتنا بھی سوانحی ذخیرہ ملتا ہے اس کی آب روز دو چند ہے اور پڑھنے والے ان قلم پاروں کو کحل البصر بنا لیتے ہیں قریب اور دور کے زمانے میں ایسے لوگ موجود رہے جو مثالی حیثیت رکھتے تھے وہ موجود رہے تو ان کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہوئی رہیں رخصت ہوئے تو آنکھوں میں آنسو بھر گئے یہ گزرنے والے افراد سرمایۂ حیات اور اعتبارِ زندگی تھے، سب کا میدان کہیں مشترک اور کہیں منفرد و جداگانہ تھا، مگر سب کے یہاں اخلاص، جہد و عمل، اور کردار و اخلاق کی روشنی پھیلی ہوئی تھی، انھوں نے اپنے کاموں اور اپنے کارناموں سے یہ باور کرایا کہ وہ انسانوں کی بھیڑ میں خصوصیت کے حامل ہیں، اور ہزاروں انسانوں کے درمیان ان کی موجودگی راحتِ قلب و جان ہے ان سے وابستہ افراد نے ان کے خوانِ علم سے ژلہ رُبائی کی اور ان کے دامن فیض سے دلوں کو صیقل کرنے کا کام لیا ان میں سے کچھ وہ ہیں جو مرنے کے بعد بھی زندہ ہیں اس لیے کہ زندگی کا معیار ایک تو ظاہری سانسوں پر ہے کہ ادھر دم نکلا اور آدمی ختم ہو گیا اور ایک معیار یہ ہے کہ رخصت ہونے والا وہ کام اس دنیا میں انجام دے کر گیا ہو جس سے اس کا نام زندہ رہے اور نسلیں اس کے کاموں کو بنیاد بنا کر بعد کے آنے والوں کو تقلید کرنے اور عمل

پیرا ہونے کی تاکید کریں۔ اس وقت میرے ذہن میں کسی صاحبِ نظر کا یہ جملہ گھوم رہا ہے ''مرتے دم تک زندہ رہنا چاہیے''۔

یہ تذکرہ ان ہی لوگوں کا ہے جو زندہ رہنے تک زندگی کی کہانی سناتے رہے، ہمت اور حوصلوں کی داستان کہتے رہے رختِ سفر باندھا تو اس داستان کو ایک نمونہ کے طور پر چھوڑ گئے۔ مولانا مفتی ساجد کھجناوری نئی نسل کے ان نمائندہ قلم کاروں میں ہیں جنھیں خداوند قدوس نے جذب وکیف سے بھی آشنا کیا، مشاہدے اور بصیرت سے بھی نوازا، عقیدتوں سے بھی جن کے دامن کو خالی نہ چھوڑا اور تاثر کی سرشاری سے بھی محروم نہ رکھا انھوں نے ڈوب کر یہ مضامین لکھے ہیں یہ ان کے تعلق کے ساتھ ان حقیقتوں کا بیان بھی ہے جو ان مرحوم حضرات کی زندگی کا جلی عنوان بن گئیں خواجہ آتش نے کہا تھا

اٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجئے

بیان تو مرحومین ہی کا ہے ذکر انہی مردانِ خدا کا ہے، بات انہی صاحبانِ قلم اور اربابِ علم کی ہے، لیکن یہ ماتم کی وہ لہریں اور سفیرانِ نالۂ وشیون کی صدیوں سے چلی آرہی وہ بازگشت نہیں جہاں عقیدتیں تارتار لباس لے کر اپنے جنون اور دیوانگی کا تماشا دکھاتی ہیں بلکہ یہاں صداقتوں کو عبارتوں، جملوں اور فقروں کے سہارے مفہوم کی پوشاک پہنائی گئی ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں آپ کو کچھ ایسے لوگ بھی ملیں گے جو یہ کہنے میں حق بجانب تھے ؎

درد کی محفل سے اٹھے گا کرامت جس گھڑی

ساتھ اپنے منفرد طرزِ بیاں لے جائے گا

اور کچھ ایسے بھی شامل ہیں جو یہ کہتے تو صحیح تھا ؎

اس انجمن میں عزیزو! یہ عین ممکن ہے

ہمارے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہے

ہر صاحبِ قلم کے لیے اس مرحلہ سے گزرنا اور شخصیت کا پورا عکس کاغذ پر اتار لینا آسان نہیں ہوتا اطراف و جوانب کو سمیٹ لینا اور شخصیت کے گرد بنے ہوئے ہالہ کے اس پار دیکھ لینا دشوار عمل ہے، مولانا محمد ساجد کھجناوری نے اس عمل کو ممکن بنایا ہے اور ان کے سیال قلم نے زیرِ تذکرہ شخصیت کا اس طرح احاطہ کرلیا ہے کہ صرف چہرہ ہی نظر نہیں آتا بلکہ اس کے علم، فضل، کمال، اخلاق، کردار، خصوصیت، امتیاز، اختصاص کے سب پہلو بیک نظر سامنے آجاتے ہیں، لکھنے والے نے سبک ورواں لب ولہجہ اور دل کو گدگداتی زبان میں ان شخصیتوں کو آبِ حیات کے قطرے دیئے ہیں وہ آبِ حیات جسے پینے کے بعد مرنے کا تصور تو ختم نہیں ہوتا ہاں مرنے کے بعد انسان اپنی رفعتوں عظمتوں اور بلندیوں کے ساتھ ضرور زندہ رہتا ہے، مولانا ساجد کھجناوری عمر کی جس منزل میں ہیں وہاں قلم جوان، فکر تازہ اور نگارش کی قوتیں بھرپور ہیں۔ بات کو سلیقے کے ساتھ ادا کرنا جانتے ہیں، لکھتے ہیں تو فرزانوں کی طرح لکھتے ہیں، جملے تراشتے ہیں تو ایک ماہر سنگ تراش کی طرح، عبارتیں ڈھالتے ہیں تو منجھے ہوئے قلم کار کی طرح، حروف والفاظ کا انتخاب کرتے ہیں تو بہترین نثر نگار کی طرح۔ ان کا حکم کہ ان کی آنے والی کتاب کے بارے میں کچھ لکھوں یہ ان کی محبتوں کا تقاضہ ہے میری کسی خوبی کا نتیجہ نہیں۔ ان کے حکم کی تعمیل ان ہی کی محبتوں اور

چاہتوں کے سبب میرے لیے طمانیتِ قلب کا باعث اور میری جانب سے اظہارِ ممنونیت ہے۔ ورنہ اس حقیقت پر میں بھی واقف ہوں کہ ان کی اس اس اعلیٰ قلمی اور ادبی دستاویز پر لکھنے کے لیے کسی عالی مقام صاحبِ قلم کو زحمت دی جاتی جو کتاب کی خوبی، تحریر کی خوبصورتی، زبان کی ندرت، اسلوب کی انفرادیت، سلاست اور روانی کو زیرِ قلم لاتا ایک ایک جملہ اور ایک ایک سطر کے محاسن پر گفتگو کرتا اور پڑھنے والے یہ کہنے پر مجبور ہوتے کہ بات اب بنی ہے لکھنے کا حق اب ادا ہوا ہے۔

مولانا ساجد کھجناوری قاسمی کی یہ کتاب اردو کی ان کتابوں کی یاد دلاتی ہے جو شخصی مضامین کی صورت میں جلوہ بکھیر رہی ہیں یا خاکوں کی شکل میں اشخاص اور افراد کی زندگی کے اجلے اور پاکیزہ اخلاق و کردار کے گوشوں کو زندگی دے رہی ہیں۔ عبدالسلام قدوائی ندوی کی ''چند تصویر نیکاں''، مرزا ہادی رسوا کی ''وضع دارانِ لکھنؤ''، خواجہ حسن نظامی کی ''قلمی چہرے'' کوثر نیازی کی ''جنھیں میں نے دیکھا'' شمیم حنفی کی ''ہم سفروں کے درمیان'' خلیق انجم کی ''مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا'' امین الدین شجاع الدین کی ''ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم'' شوکت تھانوی کی ''شیش محل'' مالک رام کی ''وہ صورتیں الٰہی'' غلام احمد فرقت کاکوروی کی ''مداوا'' اور ''ناروا'' شاہد احمد دہلوی مدیر ''ساقی'' کی ''دلّی کا ایک دور'' اور ''گنجینہ گوہر'' جاوید صدیقی کی ''روشن دان'' صباح الدین عبدالرحمن کی ''رفتگاں'' مجتبیٰ حسین کی ''آخر کار'' ملک زادہ منظور احمد کی ''شہرِ سخن'' اور ''شہرِ ادب'' پروفیسر مشیر الحق ندوی کی ''معاصر شخصیات'' عطاء الحق قاسمی کی ''مزید گنجے فرشتے'' وہ ادبی متاع ہیں جن میں زبان کے چٹخارے، اسلوب و بیان

کی لذتیں، تشبیہات ومحاورات کی شیرینی، زبان کا بانکپن، لب ولہجے کی رفعتیں، تکلف اور بے تکلفی کی وہ فضا ہے کہ پڑھنے والا ایک نئے عالم کی سیر کرتا ہے یہ وہ شخصیات ہیں جنھیں صاحبانِ قلم نے اپنے فکروفن سے زندگی کی رعنائیاں اور رونقیں عطا کی ہیں، اور کہنے والے نے جو یہ کہا ؎

ہم خاک میں ملنے پہ ناپید نہ ہوں گے
دنیا میں نہ ہوں گے تو کتابوں میں ملیں گے

یہ کتابیں مرحوم لوگوں کی اداؤں، مزاج، طبیعتوں، کاموں اور سوچ وفکر کی آئینہ ہیں اس آئینہ میں ہر شخصیت اپنے خدوخال کے ساتھ نمودار ہوتی ہے اور پڑھتے پڑھتے کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخصیت ابھی ہمارے پاس بیٹھی تھی، ابھی اٹھ کر گئی اور ابھی اس کی واپسی ہوگی، بقول جگر ؎

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں یہ آرہے ہیں، وہ جارہے ہیں

جانے والے چلے گئے کوئی واپس نہیں آیا مگر کتابوں میں وہ زندہ ہیں اور جب تک کتابیں لکھی اور پڑھی جارہی ہیں وہ زندہ رہیں گے ان زندہ کتابوں میں مولانا ساجد کھجناوری کی کتاب کا بھی شمار ہوگا اور وقت گزرنے کے ساتھ اس کتاب کی اہمیت اور افادیت قائم اور مضبوط ہوگی۔ یہی میری تمنا ہے اور اسی کی میں دعا کرتا ہوں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ تابندہ

حضرت مولانا محمد ناظم ندوی

رئیس المعہد الاسلامی مانک مئو، سہارنپور، یوپی

برادر عزیز جناب مولانا ومفتی محمد ساجد صاحب قاسمی کھجناوری کے قلم گہربار نے "بزم رفتگاں" میں جن شخصیات کے خاکوں میں نقش گری کی ہے، ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی یادوں کے نقوش بھی ان کے دل پر گہرے ہیں، اور وہ بزبان حال یہ کہہ رہے ہیں ؎

دل ہمارے یاد عہد رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

جن شخصیات پر آپ نے قلم اٹھایا ہے، ان کی خدمات کا دائرہ بڑا وسیع، متنوع اور ہمہ جہت ہے، انہوں نے ہر میدان میں تابندہ نقوش چھوڑے ہیں۔ حدیث، تفسیر، فقہ، ادب، منطق، فلسفہ، عروض، بلاغت، کلام، احسان، جہاد، سیاست، معرفت، صحافت، خطابت، فکر، حکمت، اخلاق، معاشرت غرض زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے، جہاں ان کی پیہم جد وجہد کے ثمرات ونتائج نمایاں نظر نہ آتے ہوں، ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ؎

زندگی انسان کی ہے مانند مرغ خوش نوا

شاخ پہ بیٹھا کوئی دم ، چہچہایا اڑ گیا
یا......آہ! کیا آئے ریاض دہر میں تم کیا گئے
زندگی کی شاخ سے پھوٹے ، کھلے، مرجھا گئے

ان شخصیات کی زندگی تو گم کردہ راہ مسافروں کونشان منزل کا پتہ دیتی ہے، اور ہر مشت خاک میں حرارت زندگی اور انہیں فضائے بسیط میں پروں کو پھیلانے کا نکتہ سجھاتی ہے، اور اقبال مرحوم کی زبان یہ کہتی ہے ؎

نفس گرم کی تاثیر ہے اعجاز حیات — تیرے سینے میں اگر ہے مسیحائی کر
کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم — اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

ایسی سوز عشق، درد ومحبت اور سرتا پا پیام عمل افراد کی زندگی کے تابان نقوش جن میں نئی نسل کے لئے پیغام حیات اور راہ عمل ہے، برادر موصوف نے مرتب کر کے امت کو منت کش احسان بنا دیا ہے۔

کتاب میں تقریبا چالیس شخصیات کا تذکرہ ہے۔ فنکار کی عظمت کی شناخت اور چابکدستی کا کمال یہ ہے کہ وہ اہل فکر وفن ، اور ارباب فضل و معرفت کا اعتراف وسعت قلبی اور والہانہ دلچسپی وشیفتگی سے کرے۔ ہمارے محترم مولانا محمد ساجد صاحب قاسمی نے جس حسین پیرایہ، معنویت، اور کمال اعتراف کے ساتھ ان شخصیتوں کے کیف و جمال اور ان کے خوبصورت خد وخال کو ابھارا ہے، ان کی شرافتوں و عظمتوں اور دعوت و عزیمت سے درس لینے کے طریقے بتائے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کا ان سے گہرا ربط وتعلق ہے، اور سسکتی انسانیت کا رشتہ ان سے استوار کرنا چاہتے ہیں۔ تذکرہ

میں ایسی دلآویز شخصیات بھی موجود ہیں جنہوں نے ادب و انشاء کی گلکاریوں، قلم و صحافت کی رعنائیوں اور زبان وخطابت کی شعلہ نوائیوں سے افسردہ معاشرہ کے تاروں کو ساز مضراب عطا کیا ہے، ان سے بھی مولانا کا قلم بڑی ذمہ داری سے سبک سیر ہوا۔ ایسی گوناگوں صفات کی حامل شخصیات پر قلم اٹھانا اور ان کے خاکوں میں نقش بھرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، کیونکہ بہت سے ان میں سے ایسے ہیں جنہوں نے خمخانۂ معرفت کے جام کے جام لنڈھائے ہیں، لیکن ڈکار نہیں لی، اور بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے میدان سیاست کی خارزار وادیوں میں بھی قدم رکھا، آبلہ پا بھی ہوئے، لیکن دنیائے دوں کی رنگینی سے یہ کہتے گذر گئے ؎

ع ہے زندگی کا نیا دور روشن ضمیری سے شروع!

قلم کار وسوانحی خاکہ بھرنے والوں کو ان کے ساتھ چلنا پڑتا ہے، اور سمندر کی تہوں سے اٹھتی ہوئی لہروں کے ساتھ موج وتلاطم سے بھی کھیلنا پڑتا ہے، تب قلمکار وادیب ان حقیقتوں کو اجاگر کرسکتا ہے، اور اس کے لئے بڑی محنت ودشت نوردی کی ضرورت پڑتی ہے، اور اسی دیدہ ریزی سے حیات کی معنویت ومقصدیت کو اجاگر کیا جاسکتا ہے۔ مولانا نے بڑی عرق ریزی، گہرائی وگیرائی، اپنے مطالعہ ومشاہدہ کی وسعت سے نت نئی رفعتیں اور نئے آفاق تلاش کئے ہیں، اور ان کے جوہر ادراک سے نئی نسل کو آگاہ کرنے کا فریضہ بہت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ مولانا محمد ساجد صاحب ایک فاضل نوجوان ہیں، ان کے قلم میں سنجیدگی بھی ہے، شوخی بھی، بلکہ شوخی میں سنجیدگی اور سنجیدگی میں شوخی ہے، جس سے زیرلب تبسم کا لطف ملتا ہے، البیلا انداز اور موثر طرز نگارش ہے، اور اس میں مطالعہ کا تنوع

اور مشاہدہ کی قوت بھی ہے۔ مولانا کا زمانۂ طالب علمی ہی سے قلم وقرطاس، ارباب فکروفن اوران حضرات سے جنہوں نے عشق ومحبت اورسوز دروں کی انگیٹھیاں سرد نہیں ہونے دی، ان سے برابر رابطہ اورواسطہ رہا ہے، جس کی وجہ سے ان کے قلم وقلب میں ان تاروں کی کھنک، سوز دروں کا التہاب اور حرف وحکایت کی مصوری ہے، پھر وہ اب سرزمین گنگوہ کی عظیم ومؤقر درسگاہ اشرف العلوم میں دین وشریعت کے متوالوں کی قلب وذہن کی آبیاری کررہے ہیں، اور ایک صاحب دل ومحقق ونکتہ سنج اور رموز معرفت کے آشنا حضرت مفتی خالد سیف اللہ کی ہمہ وقت زیارت وصحبت سے مستفید ہورہے ہیں، جس سے ان کی صلاحیت اوران کے دل کی انگیٹھی کو انرجی مل رہی ہے۔

مولانا سے ہمارا برسوں پرانا تعلق ہے، وہ بھی بہت محبت وغایت درجہ تعلق کا اظہار کرتے ہیں، لیکن ان کی تحریریں ساحری وپاکیزگی اوراستفادہ کی خاطر پڑھی جاتی ہیں، ان کے طرز ادا کا بانکپن اور شگفتگی وشیفتگی کا انداز روح کو شادابی اور وجدان کو تازگی عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے قلم میں اور طاقت وسلاست پیدا فرمائے، اور تسلسل کے ساتھ ان کی تحریریں ادب زندگی کے پیغام سے قارئین کو روشناس کراتی رہیں۔

(مولانا) محمد ناظم ندوی

رئیس المعہد الاسلامی مانک مئو، سہارنپور

۱۴۳۶/۶/۲۱ھ

حرفِ دوام

حضرت مولانا ڈاکٹر حکیم محمد ادریس حبان رشیدی رحیمی مدظلہ
ایم ڈی خانقاہِ رحیمی بنگلور کرناٹک

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم اما بعد

زندگی اللہ رب العزت کی ایک عظیم نعمت اور امانت ہے، جس کے ذریعے انسان درجۂ کمال حاصل کرتا ہے اور معرفت حق کے ان بے شمار مدارج کو عبور کر کے اس کائناتِ ارضی میں ایک خصوصی مقام بنالیتا ہے۔

اس دنیائے فانی میں ہزاروں، لاکھوں بلکہ کروڑوں ایسے نفوس آئے کہ جنہوں نے اس چمنستان انسانی کو اپنی انمول خدمات اور بے پناہ قربانیوں سے گلِ گلزار بنا دیا، یہی وجہ ہے کہ صناعِ عالم نے قرآن مجید کی آیات میں عقل اور اصحاب عقل کو مخاطب فرمایا، اور حضرتِ انسان کو قوتِ عقلیہ، قوتِ فکریہ اور قوتِ عملیہ کے ذریعے اپنے علم و ہنر میں معراج حاصل کرنے کا حکم دیا۔ اس کیلئے انسانی تدبیر اور تفکر کو ترقیات کا بنیادی آلۂ کار بنایا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ پھول کو دیکھنا اور سونگھنا جس قدر آسان ہے۔ پھول کی خوشبو اور اس کے فوائد و عطریات پر تحقیق کر کے لکھنا اتنا ہی مشکل ہے۔ جو چیز جس قدر اہم ہوتی ہے اسی قدر وہ غیر معمولی بھی ہوتی ہے۔ انسان اللہ رب العزت کے خزانہ کا ایک غیر معمولی جوہر اور عظیم شاہ کار ہے، جب یہ شاہ کار، صناعِ عالم کا شکر گذار بنتا ہے اور قادر مطلق کے منشا اور شہود کے مطابق زندگی کے جواہرات کو استعمال میں لاتا ہے تو کائنات کا انسانی

چمنستان کھل اٹھتا ہے۔ رحمت و شفقت کی فضا عام ہوجاتی ہے۔ محبت اور مؤدت کے جذبات عام ہوجاتے ہیں۔ علم و عرفان کی بارانِ رحمت، بے کیف زندگیوں کو جل تھل کردیتی ہے خود غرضی، مفاد پرستی کافور ہونے لگتی ہے۔ شر و فساد کا دائرہ محدود اور تنگ ہونے لگتا ہے۔ ظلم و جبر کا قلع قمع ہوجاتا ہے زہد و تقویٰ، ورع کی پاکیزہ اور سرمست ہواؤں کے جھونکے پے درپے آنے لگتے ہیں، دنیا میں امن و شانتی کا ایک مستحکم پیغام پہونچتا ہے اور اس پیغام کو لانے اور پہونچانے والے حضراتِ پیغمبر، نبی اور رسول تھے، جن کے وجود اطہر سے حرص و طمع، خود غرضی، حیوانیت، پابندِ طوقِ سلاسل ہوگئیں۔ اور انسانی اقدار کو اوجِ کمال حاصل ہوا۔

انبیاءؑ اور رسلؑ کے بعد اس امانت کا بارگراں اٹھانے والے ہر دور میں دنیا کے ہر خطہ میں موجود رہے ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ دنیا ان کو علماء، مفکر، داعین، صالحین، اور مخدومین جیسے القاب سے یاد کرتی ہے، کیوں کہ انسانوں کے جھرمٹ ہجوم اور آبادیوں سے کچھ گوہر ایسی مادی اور روحانی صفات کے حامل ہوتے ہیں جو اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے جیتے ہیں، جن کی زندگی کا چراغ اپنے گھر والوں کے لئے نہیں بلکہ دنیا اور دنیا کے بے شمار انسانوں کی رہنمائی کے لئے جلتا ہے۔ کیوں کہ آدمی ہونا آسان ہے لیکن انسان بننا اور انسان ہونا نہایت مشکل ہے، انسان وہی ہوتا ہے جو اپنے خالق و مالک سے انسیت رکھتا ہے، اور مخلوقِ خدا کا درد و غم اپنے سینے میں بسالیتا ہے اور اپنی بساط کو مخلوق کے لئے عام کردیتا ہے۔ خدمت اور نفع رسانی اسکا نصب العین بن جاتی ہیں، وہ مانندِ شمع ہوجاتا ہے کہ خود جل کر خود گھُل کر دوسروں کو روشنی پہونچاتی ہے۔

برادر اختر حضرت مولانا مفتی محمد ساجد کھجناوری دامت برکاتہم استادِ ادب و فقہ جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ نے ایسی انمول اور گراں قدر شخصیات کو اپنا موضوعِ قلم بنایا ہے جو دنیا کیلئے شمعِ فروزاں اور شمعِ ہدایت تھے جن کی خدمات اور قربانیوں کی ہندو

پاک میں خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔

''بزم رفتگاں'' کے عنوان سے 41 اکابر علماء اور مشائخ، ادباء و فضلا کرام کی گراں قدر زیست کے حسین جھرونکوں سے نایاب جھلکیں پیش کی ہیں، پڑی ہوئی چلمنوں کے حسین حسین کناروں سے موصوف نے اندر جھانک کر دیکھا اور مخمل کی اُن دل فریب اداؤں کو اپنے رشحاتِ قلم سے سمیٹا ہے کہ جن کی شامتِ عنبر سے قارئین محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ہمارے بزرگ رہنما اور روحانی پیشوا سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ وہی ہیں کہ جن کے فیضِ بے کراں سے حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم العلوم النانوتویؒ اور قطب الارشاد امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ذریعہ ایک جماعتِ حَقّہ وجود میں آئی، جنہوں نے اپنی اپنی قربانیوں اور علم و عرفاں کی مسانید سے پورے عالمِ اسلام کو معطّر کر دیا۔ ان حضرات میں خواہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ ہوں یا حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ یا بحر العلوم حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ اور ان کے فرزندِ ارجمند حضرت علامہ سید انظر شاہ صاحبؒ ہوں یا حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ہوں یکے بعد دیگرے یہ تمام ایسے روشن منارے ہیں کہ جن کی تکبیرِ توحید و رسالت کا آج دنیا میں غلغلہ ہے۔

یہ وہ حضرات تھے جن کو خالقِ ارض و سما نے دائمی نعمتوں سے سرفراز فرمایا تھا جو شکر گذاری اور مقامِ احسان کے حامل تھے، جن کی عملی زندگی سے اللہ رب العزت کی اطاعت و خوشنودی کے انوارات کا مشاہدہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ صبر اور شکر جیسے دونوں انعامات سے بہرہ ور تھے، جن کے نقشِ قدم سے شاہ راہِ اطاعت کی نشان دہی ہوتی تھی۔ جو پوری ملتِ اسلامیہ کے گوہر نایاب تھے۔

سرزمین گنگوہ سے کون صاحب ایمان واقف نہیں اور اس ناچیز کے لئے شہر گنگوہ نہایت اہم مقام رکھتا ہے کیوں کہ یہاں میری مادر علمی جامعہ اشرف العلوم رشیدی اسی بارہ اقطاب اور اولیاء کی سرزمین پر جاری وساری ہے اور اسی بستی میں خانقاہ قدوسیہ رشیدیہ موجود ہے، جن کی خوشبو میرے دل ودماغ اور میری حرکات وسکنات میں بسی ہے۔ یہاں میرے استاد محترم شریف الملت حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحبؒ احاطۂ اشرف العلوم میں آرام فرما ہیں

ہر گز نمیرد آنکہ دِلش زندہ شُد بعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما!

اور استاد الاساتذہ شیخ طریقت حضرت مولانا وسیم احمد صاحب شیخ الحدیث جامعہ اشرف العلوم حفظہ اللہ درسِ حدیث کی مسندِ رشید پر فائز ہیں جن کا علمی فیضان پورے عالم میں پھیلا ہوا ہے، جنہوں نے امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے درسِ حدیث کی تجدید فرمائی، اللہ تعالیٰ حضرت والا کا سایۂ عاطفت تادیر قائم ودائم رکھے آمین۔

اور حضرت شریف الملتؒ کے صاحبزادۂ کبیر حضرت مولانا مفتی محمد خالد سیف اللہ حفظہ اللہ اس علمی اور روحانی ورثہ اور قافلہ کی سرپرستی فرمارہے ہیں اللہ رب العزت پوری توانائی اور آب وتاب کے ساتھ آپ کے وجود مسعود کو باقی رکھے آمین!

میں اپنے تاثرات کو نہایت مختصر کرتے ہوئے یہ کہنے اور لکھنے کی جسارت کررہا ہوں کہ حضرت مولانا محمد ساجد صاحب کھجناوری مدظلہ ان اجلہ اور نابغائے روزگار شخصیات میں سے ہیں جنہوں نے دوسروں کے لئے جینے کا ہنر سیکھا ہے اور بلاشبہ ملتِ اسلامیہ کے ایک روشن نقیب ہیں کہ جن کے مذاق اور امتیازی صلاحیتوں کے طفیل کئی اہم موضوعات پر برادرانِ وطن عموماً اور مسلمانانِ ہند خصوصاً فیض یاب ہورہے ہیں، حضرت

موصوف نے ''بزم رفتگاں'' کے عنوان سے ایک متاعِ انمول قارئین کرام کے سامنے پیش کردیا ہے میں موصوف کے تعلق سے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ

؎

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
میں نے تو دل جلا کر سرِ عام رکھ دیا

اللہ تعالیٰ موصوف کی اس کاوش کو حسنِ قبولیت بخشے، آپ کے مراتب کو مزید رفعت اور بلندی عطا فرمائے اور جن رفتگانِ عقبیٰ کے لئے آپ نے لکھا اور خراج عقیدت و محبت پیش کیا ہے، یہ ان حضرات کی خدمات جلیلہ کے متعارف کرانے کا ایک حسین گلدستہ اور ہدیۂ تبریک ہے۔ مرحومین کرام کی نیکیوں اور خوبیوں کو الفاظ کا پیراہن دے کر اوراق میں محفوظ کردیا ہے تاکہ آنے والی نسلیں بھی فیض یاب ہوسکیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور اپنی شایان شان اجر جزیل عطا فرمائے۔ اور ان حضرات کی زندگیوں سے مسلمانانِ عالم کو نقشِ دوام عطا فرمائے آمین۔ ثم آمین یارب العلمین!

خاکپائے آستانہ حاذق الامتؒ

محمد ادریس حبان رحیمی رشیدی چرتھاولی

خانقاہ رحیمی بنگلور۔ ۳۹ کرناٹک

4/ اپریل بروز ہفتہ بعد نماز مغرب ۲۰۱۵ء

حرفِ ترسیل

حضرت مولانا عبدالعلی فاروقی
ایڈیٹر ماہنامہ ''البدر'' لکھنؤ

کچھ لوگ دل کے قریب اتنی آہستگی وشائستگی کے ساتھ آدھمکتے ہیں کہ جب ان کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے تو یہ طے کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ ان کا ''ورودِ مسعود'' ——— اور وہ بھی دل کے اتنے قریب ——— کب، کیسے، اور کیوں، ہوگیا؟۔

مولانا مفتی محمد ساجد صاحب سے نہ پہلے کی کوئی دید وشنید، نہ ہی کوئی رابطہ وعلاقہ ——— بس اپنے ماہنامہ ''البدر'' کے واسطہ سے ملنے والے انعامات ربانی میں سے ایک انعام مولانا ساجد صاحب کو بھی قرار دے سکتا ہوں۔

ہوا کچھ یوں کہ مولانا کے مدرسہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ سے جب ماہنامہ ''صدائے حق'' کا اجراء ہوا اور مولانا اس کے مدیر مقرر ہوئے تو انہوں نے ''البدر'' سے اس کا تبادلہ چاہا، اور اپنا رسالہ بھیجنے کے ساتھ فون نمبر پر مجھ سے ''البدر'' سے اپنے رسالہ کے تبادلہ کا قول وقرار بھی لے لیا ——— لیکن اللہ ہی بہتر جانے کہ اس پہلی ہی ''دور دور کی گفتگو'' میں وہ کیا تاثیر تھی کہ مولانا سے ایک ''ان دیکھی اور ان پرکھی'' مناسبت ہوگئی ——— اور اس کے بعد تو یہ ہوا کہ ان کے پیہم اظہار خلوص ومودت نے انہیں بے دیکھے ہی اتنا قریب کردیا کہ ان کی ہر خوشی میں شریک ہونا دل کو بھانے لگا اور ان کی ''علمی وتحریری رفتارِ ترقی'' سامان مسرت فراہم کرنے لگی۔

مولانا کی دو باتیں مجھے اپنے ذوق سے ہم آہنگ ملیں (غالباً ہماری ان دیکھی

قربتوں میں اس ذوقی ہم آہنگی کا بڑا دخل ہے) اول یہ کہ انہیں اپنے بزرگوں اور اسلاف کو یاد رکھنے اور اپنے ان محسنوں کا ذکر کرنے میں لذت ملتی ہے۔ دوم یہ کہ اپنے جذبوں کے اظہار، اور مافی الضمیر کے بیان کے لئے وہ بھاری بھرکم الفاظ اور ''مدرسی تعبیرات'' کے بجائے ہلکی پھلکی اور رواں دواں تعبیرات کا انتخاب کرتے ہیں۔

مولانا سے دور دور اور ٹیلی فون کی آدھی ادھوری ملاقاتوں اور گفتگوؤں میں ہم اپنی ''کارکردگی'' کا بھی بیان کر لیتے —— کچھ عرصہ پہلے اسی سلسلۂ گفتگو میں جب میں نے اپنی نئی کتاب ''میں نے بھی جنہیں دیکھا ہے'' کی اشاعت اور ۱۲ر فروری ۲۰۱۵ء کو اس کی رسم اجراء کی تقریب کا کچھ تفصیلی ذکر کیا، تو مولانا نے بتایا کہ اسی انداز کی ان کی بھی ایک کتاب جلد ہی شائع ہونے والی ہے —— اور پھر انہوں نے ''بزم رفتگاں'' کے عنوان سے اپنی اشاعت پذیر کتاب کے ٹائپ شدہ مسودہ کے کچھ اوراق بھیج کر مجھ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں بھی ان کی کتاب کے سلسلہ میں کچھ لکھ دوں؟۔

ظاہر ہے کہ ''کاروان سعادت'' اور اس کے شرکاء کا کسی بھی پہلو اور کسی بھی انداز میں ذکر بھی ایک کار سعادت ہی قرار دیا جائے گا، اور تذکرہ نگار کو ذوق سلیم کا حامل گردانا جائے گا۔ میری مولانا محمد ساجد صاحب کی اس اولین کتاب کی اشاعت پر خوشی اس لئے بھی دو چند ہے کہ ابھی دو ماہ سے کچھ ہی زائد عرصہ ہوا ہے کہ اسی ''سلسلۂ نسب'' کی میری بھی کتاب شائع ہوئی ہے اور بفضلہٖ تعالیٰ اس کی خوب پذیرائی ہوئی ہے —— البتہ فرق یہ ہے کہ میرا ''دائرۂ کار'' بہت محدود ہے اور جیسا کہ کتاب کے نام ''میں نے بھی جنہیں دیکھا ہے'' سے عیاں ہے کہ اس میں چند دیکھی اور برتی ہوئی شخصیات کے تعلق سے کچھ ''جذباتی انداز'' کی تحریریں شامل ہیں، اور پھر یہ تحریریں بھی خاص طور سے کتاب ہی کے لئے نہیں بلکہ مختلف مناسبتوں سے پہلے کی لکھی ہوئی تھیں —— جب کہ مولانا ساجد

صاحب نے بات ''بہت دور سے'' شروع کی ہے اور ان کے ''دائرہ کار'' میں ''دیکھی، سنی، اور پڑھی'' تینوں طرح کی شخصیات شامل ہیں۔ انہوں نے ۱۸۸۰ء میں وفات پانے والے سے لے کر ۲۰۱۵ء تک وفات پانے والے منتخب افراد کو اپنی کتاب میں شامل کیا ہے ـــــ اب یہ تو وہ خود بتا سکیں گے کہ اپنی طرف سے انہوں نے ''انتخاب کا معیار'' کیا مقرر کیا ہے؟ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ مولانا کا کام مشکل بھی تھا، طویل بھی، اور محنت طلب بھی ـــــ اور فہرست پر نظر ڈالنے سے کم از کم راقم الحروف تو مطمئن ہے کہ مولانا نے ''حق ادا کرنے'' کی بھرپور کوشش کی ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ اس زمرہ میں لکھنے والے نہ اس بات کے مدعی ہوتے ہیں، نہ ہی انہیں ایسے کسی دعویٰ کا حق ہوتا ہے کہ انہوں نے کوئی بہت ''خاص بات'' یا نئی بات لکھ دی ہے، بلکہ ایسی تحریریں تو اپنے جذبات عقیدت یا جذبات مودت والفت کے اظہار کا وسیلہ ہوا کرتی ہیں۔ بس فرق صرف اظہار و بیان کے لئے الفاظ و تراکیب کے انتخاب کا ہوتا ہے۔ اور جو لکھنے والا اپنے قاری کو اپنے جذبات سے جتنا زیادہ قریب کر لے اسے اتنا ہی کامیاب قرار دیا جائے گا۔ ـــــ اور میرا اپنا ذاتی تاثر یہ ہے کہ مولانا ساجد صاحب کو اپنی اس ''پہلی کوشش'' میں کامیاب قرار دیا جائے گا۔

میں مولانا کو بے تصنع اور رواں دواں اسلوب نگارش میں لکھی ہوئی کتاب ''بزم رفتگاں'' کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے یہ توقع رکھتا ہوں کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنیوالوں کو معلومات میں اضافہ کے ساتھ ہی ''ذوق مطالعہ'' کی تسکین کا سامان بھی ملے گا۔

عبدالعلی فاروقی

مدیر ماہنامہ ''البدر'' کاکوری لکھنؤ

۲۹ر جمادی الاخریٰ ۱۴۳۶ھ ۱۹/ اپریل ۲۰۱۵ء

حرفِ اعتبار

نواسۂ شیخ الہند جناب منظور عثمانی صاحب

قلم یا تحریر کی رسائی کہاں تک ہوتی ہے اس کا اندازہ نہ کبھی ممکن ہوا ہے نہ آج ہے، بلکہ اب تو رسل و رسائل اور کمیونیکیشن کے بے پناہ وسائل کے پیش نظر یوں بھی نہیں، دنیا کے بعید ترین گوشے سے کوئی تحریر منصہ شہود پر نمودار ہوتی ہے تو پلک جھپکتے ہی ٹیلی کمیونیکیشن کے ذریعہ عالمی پیمانے پر تشہیر پا جاتی ہے۔

کل تک مولانا ساجد صاحب نہ مجھے جانتے تھے اور نہ ہی میں، نوشتہ ہی ہمارے تعارف کا ذریعہ بنا، وجہ یہ رہی کہ سید حامد (مشہور ماہر تعلیم اور علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر) کے سانحۂ ارتحال پر میرے دو مضامین ''اک آبلہ پا وادیٔ پرخار میں تھا'' اور ''سید حامد کے شفقت نامے، مجھ خاکسار کے نام'' کئی جریدوں میں شائع ہوئے، قارئین کی جانکاری کے لئے عرض کردوں کہ سید صاحب سے احقر کا رابطہ ۱۹۷۶ء سے تھا ۱۹۸۵ء سے یہ تعلق اور گہرا ہو گیا جب تعلیمی کارواں اور کاروان صحت کے ذریعہ ہم نے ملک بھر کی خاک چھانی، خوش قسمتی سے اس مردِ عظیم نے ۲۲ ردن رات ناچیز کو اپنی معیت کا اعزاز بخشا، قربت نے دل پر مرحوم کی عظمت و شرافت کا ایسا سکہ جمایا کہ جوانمٹ ثابت ہوا، اسی تاثر کے تحت درج بالا دونوں مضامین قلم بند کئے گئے تھے، بات کیونکہ دل سے نکلی تھی ہو سکتا ہے ساجد صاحب کے دل میں اتر گئی ہو کیونکہ مولانائے محترم انہی کے حوالے سے مجھ سے متعارف ہوئے مزاجاً قبلہ کیوں کہ محکم گیر بھی واقع ہوئے ہیں اس لئے مجھے یہ نوید بھی سنا ڈالی کہ آپ نے اصحابِ دین و دانش کی رحلت

پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ترتیب دیا ہے لہٰذا از راہِ تاثر میں بھی کچھ لکھوں ، یہ مرحلہ میرے لئے واقعی سخت تھا، نہ تو میں اس قابل اور نہ ہی یہ اپنا میدان، معذرت بھی کی تو سخت گیری کا ثبوت دیتے ہوئے پورا مسودہ ہی میرے پتے پر بھجوادیا، آپ ہی کہیں موصوف نے مجھ لاچار کے لئے راہِ فرار ہی کب چھوڑی تھی گویا ع

راستے بند تھے سب کوچۂ قاتل کے سوا

مفتی محمد ساجد کھجناوری کی کتاب ''بزم رفتگاں'' پر قلم آزمائی سے قبل اتنا عرض کردوں کہ مفتی صاحب اور راقم الحروف میں مشترک اقدار نہیں بھی ہیں اور ہیں بھی، میری ساری تعلیم اول سے تا ایم اے دنیاوی جبکہ مولانا ماشاء اللہ عالم دین اور مفتیٔ شرح متین اور جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ میں مدرسِ فقہ وادب اور متعدد دینی کتب کے مصنف ومؤلف۔ ادھر میں خالص دنیادار علیگیرین۔ پیشے سے مولانا کی طرح مدرس ضرور رہا ہوں لیکن انگریزی کا۔ مصنف ہوں بھی تو غیر مفید ادبِ اردو کا۔ لیکن ساتھ ساتھ مفتی صاحب اور مجھ میں کچھ اقدار مشترک بھی ہیں، مثلاً مولانا جس تہذیب اور ماحول (دارالعلوم دیوبند) کے زیر سایہ پروان چڑھے اسی خمیر سے یہ ناچیز بھی اٹھا ہے، مولانا ذوالفقار پدر حضرت شیخ الہند میرے والد کے نانا اور والدہ کے دادا تھے، میرے دادا مولانا عبدالمومنؒ (محدث ومفسر) دارالعلوم دیوبند کے چوتھے گریجویٹ تھے، یہ حضرت شیخ الہند کے بہنوئی اور سالے تھے، خود میرے والد مولانا محبوب الٰہیؒ نامور محدث ومفسر اور خانوادہ شیخ الہند کے چہیتے نواسے تھے۔

گو بندہ راہِ بزرگاں سے کافی دور جاچکا ہے لیکن تربیت یا خون کا اثر کہئے کہ اس نسبت پر فخر ہی نہیں بلکہ جو حضرات روکھی سوکھی کھا کر خدمتِ دین میں مصروف ہیں ان کے تئیں دل کی گہرائیوں سے احترام کا جذبہ ہی رکھتا ہوں، ان حضرات کی بے

لوث خدمات کا معترف بھی ہوں، واقعتاً اصل کارنامہ تو ان اکابرین کا ہے ہمارا کیا ہم تو بقول اکبر الہ آبادیؒ

ہم کیا کہیں احباب کیا کارنمایاں کر گئے
بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مرگئے

مولانا کے مہیا کردہ مسودہ کی فہرست پر نظر ڈالی تو ۴۰ ر سے زائد مضامین میں کاروانِ دیوبند کے اولین قافلۂ سالار: حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، قاری محمد طیب صاحبؒ کے علاوہ کئی ایسی جانی مانی شخصیتیں جنہیں میں قریب سے جانتا تھا نظر آئیں، اپنے مطالعے اور جانکاری کی روشنی میں تحریر کردہ مضامین کا سرسری جائزہ لیا تو ساجد صاحب کی شخصیت کے بطور قلم کار کئی پہلوؤں نے متاثر کیا۔

سب سے پہلے تو یہی کہ کھجناوری صاحب اعلیٰ درجہ کے انشاء پرداز ہیں، بڑے رواں دواں، سلیس اور عام فہم زبان میں اپنی بات پر اثر طریقہ سے کہنے پر قادر ہیں۔ ان کی تحریر ادق، بوجھل، فارسی، عربی، گاڑھے الفاظ بغیر ترجمہ کے عربی فارسی منقولات جو ہمارے بہت سے علماء اپنا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں سے یکسر پاک ہے۔ مولانا اس حقیقت سے آشنا معلوم ہوتے ہیں کہ انشاء پردازی کا بنیادی مقصد ترسیل ہے نہ کہ اپنی لیاقت اور زورِ قلم سے قاری کو اس حد تک مرعوب کرنا کہ تفہیم ہی کا مسئلہ کھڑا ہو جائے، مجھے ایک بہت مشہور نقاد اور محقق شار احمد فاروقیؒ کا یہ جملہ یاد آتا ہے کہ ''اچھا اور حقیقت پسند رائٹر مشکل زبان استعمال کرنے پر قادر ہی نہیں ہوتا''۔ ساجد صاحب کے قلم کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بڑی احتیاط سے قلم اٹھاتے ہیں، افراط و تفریط ان کے یہاں ہے نہیں، کسی مرحوم کو زیر قلم لاتے ہوئے اکثر قلم کار کچھ زیادہ ہی کشادہ دلی اور رعایت سے مبالغہ کی حد تک کام لیتے

ہیں لیکن ساجد صاحب بڑے توازن کے ساتھ اپنے ممدوح کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ مولانا انظر شاہ، مولانا ازہر شاہ قیصر، مولانا مرغوب الرحمن اور مولانا واجد حسین وغیرہ پر آپ کے مضامین شاہ کار کا درجہ رکھتے ہیں۔ نمونتاً ''حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ کا نثری بیانیہ ہے'' یہ اقتباس دیکھیں ''مولانا کشمیری کے رشحاتِ قلم ان کے دل کی تراوش ہے، جو حق وصداقت کا خوبصورت اعلامیہ ہے، ان میں جوش ہے، ابال ہے، حرکت وفعالیت ہے، غیرت وحمیت کی للکار ہے، جذبۂ اندروں کی حسین صدائیں ہیں، سمندر کی گہرائی اور صحرا کا سکون ہے، گفتار ورفتار میں نرمی بھی، سبک خرامی بھی، شعلہ بھی ہے اور شبنم بھی، اظہارِ حقیقت بھی ہے اور دیانت کا اعتراف بھی''۔

ایسی مرصع نثر وہی لکھ سکتا ہے جو بیک وقت شاعرانہ فکر اور حسنِ بیان پر عبور رکھتا ہو، میں مولانا ساجد صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے ان مضامین کو یکجا کر کے کتاب کی صورت میں شائع کرنے کا بیڑہ اٹھایا ورنہ یہ اوراقِ پریشاں ہو کر رہ جاتے، احمد ندیم قاسمی کے لفظوں میں دعا گو ہوں ؎

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی　　اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

منظور عثمانی

۱۵/۴/۲۰۱۵ء

منظوم تعارف

جناب مولانا ولی اللہ قاسمی بستوی
استاذ جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ

حضرتِ ساجد نے لکھی ایک کتاب مستطاب
باب میں جو کہ سوانح کے ہے ٹھہری لاجواب

صاحبِ لوح وقلم ہیں ساجد کھجناوری
ان کی تحریروں سے ظاہر ہے ضیائے خاوری

ماہرِ فن ادب اچھے ہیں یہ مضموں نگار
لکھنے کا انداز ان کا ہے بڑا ہی شاندار

یہ رشیدی اشرفی گلشن کے ہیں خوش رنگ پھول
ہے دل مسرور میں ان کے سکینہ کا نزول

یہ صدائے حق رسالہ کے ہوئے اچھے مدیر
واسطے سے اس کے ٹھہرے ہیں قلم کار شہیر

یوں تو ہر مضمون ان کا ہو رہا ہے جاندار
پر خصوصاً تعزیت نامے بہت ہیں باوقار

کچھ اکابر کی سوانح پر مضامیں ہیں لکھے
ان کے خاکوں میں کلر یہ رنج آگیں ہیں بھرے

ان اکابر کے میں ناموں کو بتاتا ہوں، سنو!
یعنی ان ناموں کی میں گنتی کراتا ہوں، گنو!

قاسم وامداد گنگوہی ابوبکر وشریف
اسعد ومرغوب اسلم اور اعجاز وحنیف

تھانوی، کشمیری مدنی مصطفی طیب ظفیر
عبد قدوس وزبیر ویونس واصغر نصیر

واجد ومحمود ازہر اور خورشید وعمید
کامل وعبدکریم عثماں نشاط اک تھے فرید

وہ رئیس احمد سماعیل وعظیم ومہرباں
تھے صفی اللہ عبداللہ کے ہم قدرداں

حضرت ارشاد و محمود حسن تھے اہلِ دل — دے گئے مسعود و یامیں ہم کو دردِ مستقل

حضرت عثمان کاشف کے دلارے تھے سلیم — جن کے سینہ میں رہا ہے موجزن قلب سلیم

ان سبھی حضرات کے بارے میں تحریریں ہیں یہ — یعنی افکارِ دروں کی خوب تعبیریں ہیں یہ

اولاً سارے مضامیں ماہناموں میں چھپے — اب سنو وہ نام یہ جن ماہناموں میں چھپے

ماہنامہ ایک ہے دارالعلومِ دیوبند — دوسرا ہے ماہنامہ ترجمانِ دیوبند

ہے صدائے حق مظاہر حسن تدبیر و ریاض — فیصل و آئینہ جو اردو ادب کے ہیں ریاض

وہ محدث عصر کا اسلام کے اچھے نقوش — وہ صحافت کے جہاں میں جن کے ہیں اچھے نقوش

اب کتابی شکل میں سارے مضامیں ہیں چھپے — ہیں اثر انداز یہ جو بھی مضامیں ہیں چھپے

ساجد کھجناوری کی ہے یہ کوشش کامیاب — ہے دُعاء کہ بارگاہِ رب میں ہوں یہ باریاب

سلسلہ جاری رہے یوں خوب ہو زورِ قلم — حشر کے میدان میں باقی رہے ان کا بھرم

ان کی تحریریں مؤثر ہوں اثر ہو پائیدار — آخری دم تک قلم ان کا رہے یوں درفشار

جن اکابر کا کیا ساجد نے اس میں تذکرہ — ہے دعا طے خیریت کے ساتھ ہو ہر مرحلہ

تربتوں میں رحمتِ باری کا ہو پیہم نزول — ہر خطا سے درگذر ہو نیکیاں سب ہوں قبول

حضرت ساجد انہیں کے ساتھ ہوں روزِ شمار — اور ان کے ساتھ میں ہوں داخلِ دارالقرار

ہے ولی کی یہ دعا کہ پائیں یہ اجر جزیل — دونوں عالم میں ہمارے واسطے رب ہو کفیل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کاروانِ دیوبند کے اولین قافلہ سالار

سیدالطائفہ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ

قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

برطانوی ہندوستان میں اقامتِ دین اور حفاظتِ اسلام کے پاکیزہ مشن کیلئے جو منظم اور بامقصد تحریکیں وجود پذیر ہوکر اپنا برگ وبار لائیں ان میں دارالعلوم دیوبند مرکزی طور پر شامل رہا ہے، جو اپنے مقاصد تاسیسی صراط مستقیم کی وضاحت، سرمایہ ملت کی نگہبانی اور فروغِ تعلیم وتزکیہ پر کاربند رہتے ہوئے مسلمانانِ برصغیر کی دینی شناخت کا معتبر حوالہ قرار پایا، یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شکست وریخت کے بعد جب چاروں طرف یاس وقنوطیت کے بادل منڈلا رہے تھے اور برطانوی استعمار کے لادینی نظام نے مسلم تہذیب وثقافت سے مانوس نوخیز چہروں کو بھی تشکیل وتضلیل سے ہم آشنا کرنے کی مکروہ سازشیں بحروبر میں روا رکھ چھوڑی تھیں تو اسی مذکورہ ادارہ کے بانیان جنہیں حق جل مجدہ نے فہم وفراستِ ایمانی کی لازوال دولت سے حظ وافر بخشا تھا اور جن کی فقیری میں بوئے اسداللہی صاف ہویدا تھی اپنی خداداد بصیرت وجگر سوزی سے استفادہ کرتے ہوئے سر جوڑ کر بیٹھے۔ اس بابت پاکستان کے معروف دانشور اور دیوبند کے ممتاز فاضل ڈاکٹر رشید احمد جالندھری رقم طراز ہیں "۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد یہاں (دیوبند) کے ایک خدا رسیدہ بزرگ حاجی محمد عابد (وفات ۱۹۱۲ء) نے شہر کے اہل علم سے مشورہ کیا اور کہا کہ "علم دین اٹھا

جاتا ہے کوئی تدبیر کرو کہ علم دین باقی رہے جب عالم نہیں رہیں گے کوئی مسئلہ بتانے والا بھی نہ رہے گا جب سے دہلی کا مدرسہ گم ہوا ہے کوئی علم دین نہیں پڑھتا'' سب نے اس مشورہ کو قبول کیا اور حاجی صاحب نے پہل کر کے اپنی طرف سے چندہ دیا اور پھر چندہ جمع کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تھوڑی ہی دیر میں چار سو روپئے اکھٹے ہو گئے جس پر انہوں نے میرٹھ میں مقیم مولانا محمد قاسمؒ کو لکھا کہ آپ پڑھانے کیلئے دیوبند تشریف لائیں، مولانا محمد قاسم نے جواب میں لکھا'' میں بہت خوش ہوں! خدا بہتر کرے مولوی ملا محمد محمود صاحب (وفات ۱۸۸۶ء) کو پندرہ روپے ماہوار مقرر کر کے بھیجتا ہوں وہ پڑھا دیں گے اور مدرسہ مذکورہ میں ساعی رہوں گا''۔

ڈاکٹر رشید جالندھری آگے لکھتے ہیں کہ ''چنانچہ محمود صاحب نے ۱۵ رمحرم الحرام ۱۲۸۳ھ (۳۰ رمئی ۱۸۶۶ء) میں شہر کی ایک قدیم مسجد چھتہ میں درس دینا شروع کیا، اتفاق سے پہلے طالب علم کا نام بھی محمود ہی تھا جو آگے چل کر مذہبی حلقوں میں شیخ الہند (وفات ۱۹۲۰) کے نام سے مشہور ہوئے، پہلا درس مسجد میں انار کے درخت کے نیچے دیا گیا۔

ڈاکٹر جالندھری مزید لکھتے ہیں۔ ''جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ مدرسہ کی ابتداء چھتہ مسجد میں ہوئی، جب طالب علموں کی تعداد بڑھی تو قاضی مسجد اور کرایہ کے مکانات میں درس دیا جانے لگا...... آخر میں طے پایا کہ مدرسہ کی اپنی مستقل عمارت ہونی چاہئے، مدرسہ کی اپنی مستقل عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا'' اول پتھر بنیاد کا جناب مولانا احمد علی صاحب سہارن پوریؒ نے اپنے دست مبارک سے رکھا اور بعد میں جناب مولانا محمد قاسم و مولوی رشید احمد صاحب، مولانا مولوی محمد مظہر صاحب نے ایک ایک اینٹ رکھی گویا قیام مدرسہ سے تقریباً ۹ رسال بعد مدرسہ کی اپنی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا (دیکھئے: برطانوی ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم ایک جائزہ)۔

راقم الحروف اپنے اس مختصر سے مضمون میں صرف یہ بتانے کی کوشش کرے گا کہ یکے از بانیان دارالعلوم دیوبند قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم

نانوتوی علیہ الرحمہ کو فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ سے علماً وفکراً کس غایت درجہ کا تعلق وعلاقہ تھا اور یہ حضرات اپنی دینی تڑپ ملی شعور اور حمایت اسلام میں کس طرح ایک جان دو قالب کا مستحکم رشتہ رکھتے تھے، لاریب کہ ہر دو حضرات آیۃ من آیات اللہ تھے، دونوں کے رگ وپے میں حمیت اسلامی کا لہو گردش کرتا تھا، ان کی زندگی کے شب وروز اشاعت حق اور صراط مستقیم کی وضاحت ہی میں صرف ہوتے تھے، الحب فی اللہ والبغض للہ کا رنگ ان یاران باصفا کے کردار وعمل سے صاف جھلکتا تھا، یہی وجہ ہے کہ چشم فلک نے بھی ان کے اتقاء پر ناز کیا تو مخلوق ارضی نے ان کی نزاہت بیانی کی، چنانچہ یکتائے روزگار تذکرہ نویس صاحب نزہۃ الخواطر حضرت علامہ عبدالحی لکھنوی رقم طراز ہیں ''حضرت شیخ الامام علامہ محدث رشید احمد گنگوہی...... محققین علماء اور مدققین فضلاء میں سے ہیں، آپ صدق وعفت، توکل وتفقہ، تیز فہمی اور خطرات کا سامنا کرنے میں دین میں مضبوطی اور مذہب میں سخت ہونے میں لاثانی تھے، آپ تقویٰ، اتباع سنت نبوی میں اور عزیمت پر عمل کرنے میں شریعت پر استقامت میں اور ہر طریقے سے بدعات کو مٹانے میں، سنت کی اشاعت میں اور شعائر اسلام بلند کرنے کیلئے حریص ہونے میں، حق کو واضح کرنے میں اور شرعی حکم کے بیان کرنے میں ایک روشن نشانی اور ایک ظاہر نعمت تھے، آپ لوگوں کی باتوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے، نہ کسی تحریف کو قبول کرتے اور نہ کسی منکر کو برداشت کرتے باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طبیعت میں تواضع ونرمی کو ودیعت کیا تھا'' (الرشید ساہیوال کا دارالعلوم دیوبند نمبر سے ایک اقتباس، ص ۱۷۳)۔

مذکورہ یہ شہادت حضرت گنگوہیؒ کے مقام ومرتبہ کا ایک ایسا آئینہ ہے جس سے ان کی علمی وعرفانی شخصیت کے گوناگوں ممتاز گوشے صاف دکھائی دیتے ہیں، اسی طرح آپ کے معاصر دوست حجۃ اللہ فی الارض حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے بارے میں صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں ''حضرت شیخ الامام عالم کبیر قاسم بن اسد علی صدیقی نانوتوی

ربانی علماء میں سے ہیں آپ لوگوں میں سب سے زیادہ زاہد، عبادت گذار، بکثرت ذکر ومراقبہ کرنے والے اور علماء کی طرح لباس عمامہ چادر وغیرہ پہننے سے دور بھاگنے والے تھے، اس زمانہ میں آپ نہ فتویٰ دیتے تھے اور نہ وعظ کرتے تھے بلکہ اللہ سبحانہ کے ذکر ومراقبہ میں مشغول رہتے تھے، حتیٰ کہ آپ پر حقائق ومعارف کے دروازے کھلے اور حضرت شیخ امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو خلافت سپرد کی اور آپ کی مدح فرمائی کہ قاسم جیسا شخص سوائے زمانہ سلف کے کہیں نہیں پایا جاتا" (حوالہ مذکورہ)۔

صاحب نزہۃ الخواطر کی طرح محدث کبیر استاذ الاساتذہ حضرت علامہ محمد یوسف بنوری مذکورہ دونوں بزرگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لامع الدراری کے مقدمہ میں لکھتے ہیں ''حضرت شیخ عبدالعزیز دہلویؒ کے علوم کے وارث دو جلیل القدر عالم ہوئے اور وہ حضرت امام وحجہ محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت محدث وفقیہ وحجت شیخ احمد گنگوہیؒ ہیں، ہاں دونوں اماموں کے ہر دو جانب سے بہرہ مند ہونے کے باوجود حضرت نانوتوی پر متکلمین کے علوم اور حقائق کے علوم کا غلبہ ہے اور حضرت شیخ گنگوہی پر فقہا کے علوم اور سنت کے علوم کا غلبہ ہے، لیکن ایک میں حقائق کا پہلو مغلوب ہے جبکہ دوسرے میں فقہاء کے علوم کا پہلو مغلوب ہے اور خلفائے راشدین کے ساتھ علوم نبوت اور اس کے کمالات کی تقسیم میں ادنیٰ سی مشابہت ہے" (حوالہ مذکورہ)۔

شیخین جلیلین حضرت گنگوہی ونانوتویؒ ہر دو بزرگوں نے ملت کی مسیحائی کا فریضہ جس شان سے انجام دیا اور ملت بیضاء کی کشتیٔ کارواں کو جس طرح ساحل مراد تک پہنچایا اس کے نشیب وفراز اور مصائب وامتحانات سے تاریخ کے صفحات پٹے پڑے ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے سوانحی نقوش ایجاز واختصار کے ساتھ یہاں پیش کردیئے جائیں جس سے ان یاران باصفا کا آغازِ رفاقت وتعلق سامنے آسکے۔

فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی ۶ ر ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۱ر مئی ۱۸۲۹ء بروز پیر چاشت کے وقت ضلع سہارنپور (انڈیا) کے مشہور قصبہ گنگوہ کے محلہ سرائے کے اس مکان میں ولادت ہوئی جو شیخ المشائخ حضرت مولانا عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خانقاہ کے متصل تھا، والد کا نام مولانا ہدایت احمد بن قاضی پیر بخش تھا، ماں اور باپ دونوں میزبانِ رسول سید حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اولاد سے تعلق رکھتے تھے ، فارسی میں مولانا محمد تقی ماموں مولوی محمد غوث صاحب عربی میں استاذ الکل مولانا مملوک علی صاحب (والد ماجد حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ) حدیث پاک میں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی آپ کے اساتذہ رہے (حوالہ: تالیفات رشیدیہ)۔

حضرت گنگوہی کے بغرض تعلیم دہلی آنے کا سن ۱۲۶۱ھ ہے جہاں آپ نے درسیات کی متعدد کتب مختلف حضرات سے پڑھیں، جبکہ متوسطات سے اوپر کی کتب استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے پڑھیں، یہیں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے تعلق قائم ہوا جو پھر ساری عمر قائم رہا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی خدمت میں رہ کر بیعت کا شرف حاصل کیا، حضرت مولانا یعقوب نانوتوی نے سوانح قاسمی میں لکھا ہے کہ ''جناب مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولوی محمد قاسم صاحب سے اسی زمانہ سے ہم سبقی اور دوستی رہی ہے، آخر میں حدیث جناب شاہ عبدالغنی صاحبؒ کی خدمت میں پڑھی اور اسی زمانہ میں دونوں صاحبوں نے جناب قبلہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا، انہوں نے بڑی تیز رفتاری سے سلوک کی منزلیں طے کرلیں، چنانچہ صرف چالیس دن کی مدت میں خلافت سے سرفراز کئے گئے اور گنگوہ واپس آکر حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے حجرے کو اپنی قیام گاہ بنایا، اسی دوران میں مطب ذریعۂ معاش رہا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت کی تحریک بھی

اغلباً حضرت نانوتوی ہی کی مرہون تھی، اس لئے حضرت گنگوہی فرمایا کرتے تھے "مولوی محمد قاسم نے اعلا حضرت کی تعریفیں کر کے ہمیں مرید کرایا اور بعد میں اعلیٰ حضرت سے اصرار وکوششیں کر کے مولوی محمد قاسم صاحب کو ہم نے مرید بنوایا"۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بھی اگر چہ حضرت مولانا کے بچپن کے دوست، ہم مرشد اور بے تکلف تھے لیکن حضرت مولانا کی نگاہ میں حضرت گنگوہی کا جو مرتبہ تھا وہ غیر معمولی تھا جس کا اندازہ ذیل کے اس مکتوب سے ہوتا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''عزیز من! نہ میں اس قابل کہ خود کسی کی رہبری کروں اور نہ اس قابل کہ کسی رہبر کو پہچانوں اور دوسروں کو بتلاؤں، البتہ دو چار بزرگوں سے عقیدت ہے، ایک تو جناب حاجی امداد اللہ صاحب، دوسرے شاہ عبدالغنی صاحب، ان کے بعد جناب مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی، ان بزرگوں میں سے جس کی صحبت میسر آجائے غنیمت جانوں اور اپنے حصہ کی تفتیش میں نہ رہو'' (باقیات فتاویٰ رشیدیہ، ص ۱۰۰)۔

سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ہمارے علماء دیوبند وسہارنپور کے شیخ طریقت اور سرپرست رہے ہیں، اللہ رب العزت نے انہیں تصوف وسلوک میں یکتائے روزگار بنایا تھا۔ ہندوستان کی جہاد آزادی میں بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، حاجی صاحب ۲۲ر صفر المظفر ۱۲۳۳ھ مطابق یکم جنوری ۱۸۱۸ء پنجشنبہ کو اپنی ننیہال نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے، آپ کی دادھیال تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں تھی آپ کے والد گرامی کا نام حافظ محمد امین تھا، آپ کا تاریخی نام ظفر احمد ہے جس سے ۱۲۳۳ھ برآمد ہوتی ہے، والد ماجد نے آپ کا نام امداد حسین رکھا تھا لیکن حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی (نواسہ شاہ عبدالعزیز دہلوی) کے ایما پر آپ نے امداد اللہ نام اختیار کیا، کیونکہ امداد حسین میں بوئے شرک آتی تھی، حضرت حاجی صاحب نے ابتدا میں حضرت شاہ نصیر الدین دہلوی سے سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کی تھی

لیکن استفادہ زیادہ مدت نہیں رہا حضرت تھانوی کی روایت کے مطابق خرقۂ اجازت سے بھی شرف ہوئے، مگر قرار حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ کے یہاں جا کر ہوا اور اجازت یاب ہوئے، حاجی صاحب نے ۱۲رجمادی الآخر شب چہار شنبہ ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸راکتوبر ۱۸۹۹ء میں مکہ معظمہ میں وفات پائی اور جنت المعلی میں مدفون ہوئے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی پیدائش بقول حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ شعبان یا رمضان ۱۲۴۸ھ ہے، آپ کا آبائی اور پیدائشی وطن سہارنپور کا مشہور قصبہ نانوتہ ہے، ابتدائی تعلیم یہیں رہ کر حاصل کی، مکتبی تعلیم کے بعد انہیں دیوبند پہنچا دیا گیا جہاں کچھ دن مولوی مہتاب علی کے مکتب میں رہے پھر اپنے نانا کے پاس سہارنپور چلے گئے جو وہاں وکیل تھے پھر سہارنپور میں ہی عربی صرف ونحو کی کتب پڑھنے کے بعد ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء کے آخر میں ان کو حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی اپنے ہمراہ دہلی لے گئے وہاں کافیہ اور دوسری کتابیں پڑھیں، بعد ازاں انہیں دہلی کالج میں داخل کر دیا گیا، سرسید مرحوم بانی علیگڈھ مسلم یونیورسٹی جو حضرت نانوتوی کے معاصر ہیں اور اسی کالج کے فیض یافتگان میں سے تھے، مولانا نانوتویؒ کے علم وفضل اور ذکاوت وذہانت کی اس طرح وکالت کرتے ہیں ''لوگوں کو خیال تھا کہ جناب مولوی محمد اسحاق صاحب کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے مگر مولوی قاسم صاحب نے اپنے کمال نیکی دینداری تقوی اور ورع ومسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دلی کی تعلیم وتربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ (تاریخ دار العلوم نمبر)۔

سحر طراز نثر نگار مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ نے تحریک دیوبند پر حضرت نانوتوی وحضرت گنگوہیؒ کے ہمہ گیر اثرات اور اس کے مشعل راہ خطوط کی تعیین وترتیب کے تعلق

سے بڑے پتے کی بات لکھی ہے، فرماتے ہیں ''حضرت نانوتویؒ از ہر الہند دار العلوم دیوبند کے بانی نہیں بلکہ فکر کے امام ہیں وہ صرف ایک عالم نہیں بلکہ جنود ربانیہ کے سالار ہیں، وہ ایک فرد نہیں بلکہ وقت کی امت ہیں، انہوں نے دار العلوم قائم کر کے پچھلوں کو وہ متاع بے بہا عنایت فرمائی جس کے بارِ احسان سے اخلاف کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے ...... مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتویؒ تحصیل علوم ہی میں ایک دوسرے کے رفیق نہیں بلکہ سلوک وتصوف میں بھی ایک دوسرے کے رفیق سفر ہیں، ان دونوں کے شیخ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دونوں مریدان باصفا کے متعلق ضیاء القلوب نامی تصنیف کے آخر میں رقم طراز ہیں کہ '' انقلاب کا یہ رنگ بھی قابل دید ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے مجھ سے بیعت کی حالانکہ مجھے ان سے مرید ہونا چاہئے تھا'' ...... آج دیوبند کے مزاج میں سنت کا غلبہ، بدعات سے نفرت، اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ وافر اور دین حق کے قیام کیلئے سرگرمی بلاشبہ حضرت مولانا گنگوہی کی وراثت ہے اور بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کو بھی منہاج قویم پر کھینچنے والے موصوف ہیں۔ (لالہ وگل رص ۳۲)

حضرت مولانا عبداللہ سندھی کی ایک چشم کشا تحریر جس سے حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ کے فکر وعمل کی یکسانیت مترشح ہوتی ہے مولانا مفتی عبدالخالق آزاد کے شکریہ کے ساتھ پیش خدمت ہے لکھتے ہیں '' شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی سید الطائفہ امیر امداد اللہ مکی کے وکیل اور نائب تھے ان کے وصال کے بعد ان کی جگہ ہمارے شیخ شیخ الاسلام رشید احمد گنگوہی حضرت حاجی صاحب کے وکیل ونائب اور جامعہ قاسمیہ دیوبند کے رئیس اور سرپرست تھے، مولانا محمد یعقوب نانوتوی دیوبند دار العلوم دیوبند میں میں ان کے معاون اور نائب تھے، مولانا محمد یعقوب نائب اول تھے اور ہمارے استاذ شیخ الہند نائب ثانی تھے۔ پھر آگے لکھتے ہیں:

(۱) شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور شیخ الاسلام حضرت مولانا رشید احمد

گنگوہی دونوں حضرات ولی اللہی کے طریقہ فکر وعمل میں بالکل متحد تھے۔

(۲) ان دونوں حضرات نے اول عقلی اور فقہی علوم وفنون ایک ہی استاذ یعنی حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی سے حاصل کئے۔

(۳) ان دونوں حضرات نے علم حدیث ایک ہی استاذ یعنی حضرت مولانا شاہ عبدالغنی دہلوی سے حاصل کیا۔

(۴) ان دونوں حضرات نے طریقہ تصوف ایک ہی شیخ یعنی سیدالطائفہ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے حاصل کیا۔

(۵) پھر دونوں حضرات کا اس تحقیقی مسئلہ میں بھی اتفاق رہا ہے کہ طاغوتی کفر (برطانوی سامراج) کے مقابلہ پر جہاد کیا جائے۔

(۶) اس جہاد کے سلسلہ میں ایک ہی امیر یعنی حضرت حاجی صاحب امداداللہ مہاجر مکی کی قیادت میں کرنے پر بھی ان دونوں کا اتفاق تھا۔

(۷) دونوں حضرات (1857 کی جنگ آزادی میں) وارنٹ گرفتاری اور اس سے بچنے وغیرہ سے متعلق آزمائش اور ابتلا میں بھی باہم شریک تھے۔

(۸) ایک ہی طریقہ کار کے مطابق علوم دینیہ کی اشاعت کے سلسلہ میں بھی بالکل متحد تھے (فکر انقلاب: شیخ الہند مولانا محمود حسن رص ۶۶)۔

(یہ مضمون مولانا محمد اعجاز عرفی کی فرمائش پر لکھا گیا تھا جو ''فکر انقلاب'' کے حضرت نانوتویؒ پر خصوصی نمبر ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا)

قائد حریت

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیو بندیؒ

از ہرالہند دارالعلوم دیو بند کے مایہ ناز سپوت اور تحریک حریت کے علمبردار شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیو بندیؒ (۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء۔۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) قافلہ علم وکمال کی ان گرانمایہ شخصیات میں سے تھے جن کے مختصر سے وجود میں مبدأ فیاض نے علم وعمل، خوف وخشیت، تقویٰ وطہارت جرأت وشجاعت اور حکمت وفراست کے کتنے ہی باب روشن فرمادئے تھے، وہ ایک عالم ربانی اور قوم وملت کی مسیحائی کا تابندہ عنوان تھے۔ ان کے رگ وریشہ میں حمیت دین اور غیرت اسلام کا لہو گردش کرتا تھا، وہ ایسے علم وفلسفہ کی تبلیغ واشاعت کے طرح دار تھے جو حضرت انسان کو خودشناسی سے بڑھ کر خداشناسی کا عنوان بتائے۔ انہوں نے ایسے ناگفتہ بہ حالات میں اس دنیائے رنگ وبو میں آنکھیں کھولیں جب سات سمندر پار کے گوری چمڑی والے غاصب انگریز اس ملک کے کرتا دھرتا بن گئے تھے اور برادران وطن بھی مشق ستم بنے ہوئے تھے، ان کے دن لد گئے تھے اور فصل بہار موسم خزاں کا منظر پیش کررہی تھی۔ نام ور ادیب عربی مولانا ذوالفقار علی دیو بندیؒ کا یہ فرزند ارجمند اپنی آنکھوں سے زمانہ کے تیزی سے بدلتے نشیب وفراز کا مطالعہ کررہا تھا وہ صاف دیکھ رہا تھا کہ کس طرح بیرونی طاقتوں نے مادر وطن کو اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑ لیا ہے، انہیں ذہنی وجسمانی سطح پر ٹارگیٹ کیا جانے لگا ہے، وہ صبر کرتا رہا لیکن پانی جب سر سے اونچا ہونے لگا تو آخرش یہ مرد مجاہد حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کے علوم وفنون کا یہ وارث اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا عاشق زار میدان عمل

میں کود پڑا۔ چنانچہ استخلاص وطن کی خاطر تن من دھن کی قربانی دینے کا فیصلہ اس وقت تک کیلئے کرلیا گیا کہ جب تک آزادی کا چراغ روشن نہیں ہو جاتا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۰۵ء میں ایک روڈ میپ تیار کیا جس کا مقصد مسلح جدو جہد کی صورت میں ہندوستان سے انگریزوں کا حکومتی نظام تباہ کرنا تھا، حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی اس تحریک کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ہندوستان اور بیرون ممالک میں پھیلے اپنے شاگردوں اور رفقائے کار کو نہ صرف متحرک کیا بلکہ اس کٹھن راہ کی مطلوبہ قربانیوں سے بھی انہیں آگاہ کیا، اسی تحریک کے بانیان میں حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، مولانا محمد صادق اور مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کے علاوہ مولانا عبیداللہ سندھی بھی سرفہرست شمار ہوتے ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کی جدوجہد کے دو محاذ تھے، ایک اندرون ملک کہ جس سے جذبۂ آزادی کو بیدار کرکے فداکاروں اور جانبازوں کی ایک ایسی ٹیم تیار کی جائے جو تمام مصائب ومشکلات کا خندہ روی سے مقابلہ کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہے، جبکہ دوسرا محاذ بیرون ملک کا تھا جہاں سے اسلحہ وفوج کی مدد سے ہندوستان پر حملہ کرکے برطانوی حکومت کا قلع قمع کیا جاسکے۔اس کے لئے آپ

کی نگاہ انتخاب افغانستان اور ترکی پر پڑی، افغانستان پر اس لئے کہ اس کی سرحد ہند سے متصل تھی اس لئے وہاں سے فوجی یا عسکری مدد حاصل کرنا آسان تھا، چنانچہ اس کیلئے وہاں کے آزاد علاقہ یاغستان کو چنا گیا، یہاں ویسے بھی دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتگان کی خاصی تعداد تھی اور وہ حضرت شیخ الہندؒ سے شرف تلمذ رکھتے تھے، دوسری طرف جرمنی اور ترکی حکومت سے مدد حاصل کرکے استعماری حکومت کے پیر اکھاڑنا تھا تاکہ انگریز کا ملک میں رہنا دشوار ہو جائے اور وہ دونوں محاذوں کی اس منظم لڑائی سے دل

برداشتہ ہو کر ملک چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر آپ نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو کابل جبکہ مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کو آزاد قبائل میں جہاد کی تلقین کیلئے بھیجا اور خود ۱۹۱۵ء میں حجاز کیلئے روانہ ہوئے، اس سے قبل ڈاکٹر انصاری نے آپ کو خبر دی کہ برطانوی حکومت نے آپ کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیے ہیں اس لئے آپ فوراً عملداری سے نکل جائیں۔ حضرت شیخ الہندؒ ۹ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کو مکہ معظمہ پہنچ گئے اور اپنے منصوبہ بند پروگرام کے مطابق غالب پاشا گورنر حجاز سے ملاقات کی۔ اس نے حسب توقع ہر طرح کی مدد کا یقین دلایا اور تحریر بھی لکھ دی، اس کے بعد ترکی کے وزیر دفاع انور پاشا اور شام کے گورنر جنرل جمال پاشا سے بھی آپ کی کامیاب ملاقاتیں ہوئیں۔

ادھر پہلی جنگ عظیم کے چھڑ جانے سے حالات ایسے خراب ہوئے کہ یاغستان جانا ممکن نہیں رہا، اگرچہ آپ کی حاصل کردہ تحریر وہاں پہنچ کر تقسیم ہو گئی تھی، پھر آپ نے استنبول (ترکی) جانے کا پروگرام بنایا۔ لیکن اسی دوران شریف مکہ نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی اور اس لئے استنبول کا سفر بھی نہ ہو سکا جیسا کہ ما قبل میں بھی لکھا کہ غالب پاشا کی تحریر کی نقول ہندوستان اور یاغستان پہنچا دی گئی تھی، اس اہم خدمت کو مولانا منصور انصاری نے نہایت چابکدستی اور راز داری کے ساتھ انجام دیا تھا اور وہ کابل آ گئے تھے، یہیں کابل سے مولانا سندھی اور مولانا انصاری نے اپنی کارگزاریوں کی الگ الگ رپورٹ مرتب کر کے جولائی ۱۹۱۶ء میں اپنے ایک معتمد عبدالحق نامی تحریک کے ایک کارکن کے حوالہ کر دی کہ پوری رازداری کے ساتھ یہ شیخ عبدالرحیم سندھی کو پہنچا دے تا کہ وہ اسے حضرت شیخ الہند تک پہنچا سکیں مگر اس اللہ کے بندے نے اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے یہ خطوط اپنے مربی خان بہادر نواز خان کو دیدیے، خاں صاحب نے انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ خطوط پنجاب کے گورنر

سرمائیکل اوڈوائر کے حوالہ کردئے۔ یہ تین خطوط تھے دو حضرت شیخ الہند کے نام اور ایک شیخ عبدالرحیم سندھی کے نام۔ یہ تینوں خط زرد رنگ کے ریشمی کپڑے پر تھے، برطانوی حکومت جو پہلے سے ہی حضرت شیخ الہند کی سرگرمیوں سے متوحش تھی، اب ریشمی خطوط حاصل ہونے کے بعد تو انہیں تحریک سے متعلق بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں، چنانچہ شریف مکہ کے ذریعہ حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء کار مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا عزیز گل مولانا حکیم نصرت علی اور مولانا وحید احمد کو گرفتار کرلیا گیا اور ایک ماہ جیل رکھنے اور بیانات لینے کے بعد ۱۶ رفروری ۱۹۱۷ء کو مالٹا بھیجد یا گیا، جہاں پانچ دن کے بعد ۲۱ رفروری کو پہنچ گئے اور تقریباً تین سال دو ماہ اسارت فرنگ میں گذارکر ۲۰ رفروری ۱۹۲۰ء کو رہائی نصیب ہوئی، راہ میں ڈھائی تین ماہ مختلف مقامات پر گذارتے ہوئے ۸ رجون ۱۹۲۰ء کو قائد حریت میدان عمل میں واپس آ گیا۔

حضرت شیخ الہند ہندوستان کے شہر ممبئی میں وارد ہوئے تو تحریک خلافت کے روح رواں مولانا شوکت علی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور احمد آباد گجرات سے گاندھی جی نے ممبئی آکر آپ کا استقبال کیا اور آپ سے مشورہ کے بعد مستقبل کا لائحہ عمل تیار کیا، یہ تھے حضرت شیخ الہندؒ جو بقول حقانی القاسمی ''نہ مصلحت پسند تھے نہ مفاد پرست'' بس انہیں انگریزوں سے خدا واسطے کا بیر تھا اور ان کو انگریز اور انگریزی حکومت سے کتنی سخت نفرت تھی کہ یوپی کے گورنر جیمس میٹن نے کہا تھا ''اگر اس شخص کو جلا کر خاک بھی کردیا جائے تو وہ بھی اس کوچہ سے نہیں گذرے گی جس میں کوئی انگریز ہوگا اور یہ بھی کہا کہ ''اگر اس شخص کی بوٹی بوٹی کردی جائے تو ہر بوٹی سے انگریز کی عداوت ٹپکے گی۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں عالمی نقشہ پر ابھرنے والی حضرت شیخ الہندؒ کی یہ تحریک اتنی منظم اور ہمہ گیر تھی کہ اگر یہ کامیابی سے ہم عناں ہوجاتی تو آج برصغیر کا نقشہ ہی

کچھ اور ہوتا، مزید براں اہل وطن کو ۱۵ / اگست ۱۹۴۷ء تک انتظار نہ کرنا پڑتا، اس انقلابی تحریک پر اب ایک صدی بیت رہی ہے لیکن حکومتی سطح پر حریت کے ان دیوانوں کو یا تو مکمل فراموش کر دیا گیا ہے یا پھر زور زبردستی کے اعتراف کے ساتھ ان کے نام لیواؤں کو کھلونے دے کے بہلایا گیا ہے، کیا صرف ڈاک ٹکٹ کے اجراء اور دوسری شخصیت کے نام پر تعمیر شدہ کالج کو شیخ الہند کی طرف منسوب کر کے ایوان اقتدار نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے؟ اس پر ٹھنڈے دل ودماغ سے سوچنے کی ضرورت ہے۔

کاش اگر آج تحریک ریشمی رومال کا یہ بانی زندہ ہوتا تو پھر وہ اپنے ان الفاظ کو دوہراتا کہ ''یہ میری قوم بڑی بھولی بھالی ہے جو صرف لفظوں ہی سے خوش ہو جاتی ہے''۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے بند خول سے ذرا باہر جھانک کر دیکھیں، اسلام کی دعوت وتبلیغ کیلئے جہد وعمل کے دائرہ کو مزید وسعت دیں یہ سبق ہمیں اس تحریک کے بے مثال بانی سے بھی ملتا ہے، راقم السطور اپنے اس مضمون کو حضرت شیخ الہندؒ کے ایک چشم کشا اقتباس پر ختم کرتا ہے، حضرت فرماتے ہیں ''اسلام صرف عبادت کا نام نہیں ہے، سیاست، اقتصادیات، تجارت اور اسی طرح زندگی کے تمام شعبوں کو اسلام نے اپنے اندر سمیٹ رکھا ہے جو شخص موجودہ کشمکش زمانہ سے پہلو تہی کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ حجرے میں بیٹھے رہنا اسلام کی خدمت کیلئے کافی ہے تو وہ کان کھول کر سن لے کہ اس کا وجود اسلام کے پاک وصاف دامن پر ایک بدنما داغ ہے''۔

(بہ شکریہ ''فکرِ انقلاب'' دہلی خصوصی نمبر)

دین وشریعت کے رمز شناس

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ بیسویں صدی کی ان بلند پایہ علمی اور عملی سرکردہ شخصیات میں سے تھے، جن کو مبدأ فیاض سے علوم وعرفان کے بے پناہ خزینے ودیعت ہوئے تھے، ان عباقرہ اور فخر روزگار اکابر وعلماء میں شش پہلو شخصیت کے حامل حضرت تھانویؒ نے بتوفیق الٰہی فقدان وسائل کے باوجود ملت اسلامیہ ہندیہ کی دینی، فکری، ادبی، اصلاحی، سماجی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی ارتقاء میں فقید المثال خدمات سرکر کے غیر اعلانیہ طور پر اپنے مجدد ہونے کا عملی ثبوت فراہم کیا ہے، آپ نے مسلمانوں کے فکری زاویوں کو جس طرح تبدیل کر کے اس میں اسلامی سوز وگداز کی تخم ریزی کی وہ دراصل حضرت تھانویؒ ہی کے بس کی بات تھی، اس لئے کسی شاعر نے خوب اچھا کہا کہ!

وہ حکیم امت مصطفیٰ و مجدد طرق ہدی
اشرف علی مہ ارتقاء شمس المعارف والتقی
وہ جو بانٹتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے
جو عمل سے اپنے نمونہ عمل صحابہ دکھا گئے

دراصل حضرت تھانویؒ کی ذہنی اور فکری آبیاری اسی الہامی درسگاہ میں ہوئی تھی جس کو دنیا ازہر ایشیاء دارالعلوم دیوبند کے نام سے جانتی ہے اور جس کے بام ودر اور روشن مناروں سے قال اللہ وقال الرسول کے آوازے آج بھی بلند ہو رہے ہیں، حضرت تھانویؒ نے یہاں کے روحانی اور پاکیزہ ماحول میں رہ کر کم وبیش پانچ سال تک خوان قاسمی سے

خوشہ چینی کی، آپ نے اس وقت کے جن خضر صفت اور اساطین علم وعمل سے اکتساب فیض کیا ان میں تحریک شاہ ولی اللہی کے ترجمان حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، ولی کامل حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور قائد حریت شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبند وغیرہم بطور قابل ذکر ہیں، یہ سب علما اور درویش اپنے وقت کے آفتاب و ماہتاب تھے جو درحقیقت ہند میں سرمایہ ملت کے نقیب ونگہبان تھے، کتب احادیث آپ دیوبند میں دوران قیام پڑھ چکے تھے، پھر بعد میں مکہ مکرمہ کی حاضری پر قرأت قرآن کی مشق آپ نے مشہور قاری عبدالرحمن مکیؒ سے کی، دارالعلوم دیوبند سے رسمی فراغت کے بعد آپ نے تدریسی مشن کا آغاز مدرسہ فیض عام کانپور سے کیا اور بہت جلد آپ کے فضل وکمال کا اور علمی عظمتوں کا سکہ اہل کانپور کے دلوں پر بیٹھ گیا، تدریس کے علاوہ اصلاحی خطاب اور وعظ وتقریر نے آپ کی شہرتوں کو چار چاند لگائے، اسی دوران آپ پر انتظام مدرسہ نے چندہ وغیرہ کے لئے اپیل کرنے پر زور دیا مگر حضرت کی رائے اس کے برعکس تھی، حضرت کا خیال تھا کہ وعظوں اور تقریروں کے درمیان چندے کی اپیل اور درخواست وعظ ونصیحت کو بے اثر کردیتی ہے، اس پر اہل مدرسہ چہ می گوئیاں کرنے لگے، حضرت تھانویؒ نے اسے بھانپ لیا اور یہاں سے استعفیٰ دے کر اہل کانپور کے شدید اصرار کو دیکھتے ہوئے جامع (جامع العلوم) میں تدریسی فرائض انجام دینے لگے، یہاں آپ کا چودہ سالہ قیام طالبان علوم نبوت اور لوگوں کے لئے بے حد نافع ہوا مگر آپ کا انجذاب الی اللہ اور عشق الٰہی کا خوبصورت جذبہ بھی پروان چڑھتا رہا، چنانچہ دوران طالب علمی جبکہ دارالعلوم میں فروکش تھے قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے ان کی دارالعلوم دیوبند آمد پر بیعت کرنے کی درخواست کی لیکن انہوں نے دوران طالب علمی اسے مناسب نہیں سمجھا، بالآخر جب ۱۲۹۹ میں حضرت گنگوہیؒ عازم سفر ہوئے تو آپ نے

حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کی خدمت میں ایک عریضہ بھیجا جس میں لکھا کہ:
''آپ مولانا گنگوہیؒ سے فرمادیں کہ مجھ کو بیعت کرلیں'' لیکن حضرت حاجی صاحب نے آپ کے ذوق عرفان کو دیکھ کر خود ہی بیعت فرمالیا، اس وقت آپ کی عمر انیس سال تھی یہ وہ وقت تھا جب آپ کانپور میں اقامت پذیر تھے، یہیں سے آپ حج بیت اللہ کیلئے تشریف لے گئے، آخر کار آپ کے روحانی اور باطنی انقلاب نے تدریسی دلچسپی ختم کردی اور آپ ملازمت سے دست کش ہوکر اپنے روحانی مرشد حضرت حاجی صاحب کے ایماء پر وطن مالوف تھانہ بھون میں ۱۳۱۵ھ کو تشریف لے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار فرمائی، یہیں آپ اپنے پیرو مرشد کی آخری یادگار ''خانقاہ امدادیہ'' میں براجمان ہوگئے، حاجی صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے آپ کو لکھا کہ:
''بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے امید ہے کہ آپ سے خلائق کثیر کو فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا اور آپ ہمارے مدرسہ (دارالعلوم) و مسجد کو از سر نو آباد کریں، میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں اور خیال رہتا ہے'' (مکتوبات امدادیہ ۳۶)۔
حضرت تھانویؒ خانقاہ امدادیہ میں فروکش ہوکر اصلاح وارشاد وعظ وتذکیر اور تصنیف وتالیف کا فریضہ انجام دینے لگے اور ظلمت کے اس نازک ترین دور میں جبکہ امت مسلمہ ہندیہ رسومات وبدعات وخرافات کے قعر مذلت میں جاگری تھی اور صحیح اسلامی فکر جو حضرات سلف صالحین ائمہ مجتہدین سے متواتر چلی آرہی تھی زمانہ اور دوری کے سبب اپنے اصل مغز، صحیح اسپرٹ اور روح کے اعتبار سے روبہ زوال تھی، حضرت تھانویؒ نے اپنی بے مثال علمی اور اصلاحی جانفشانی ومعرفت ربانی کے طفیل اسکا بروقت ادراک کرکے اصل اور کھوٹ کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیا، آپ کی اصلاحی کوششوں سے اسلامک سوسائٹی میں انقلاب برپا ہوا اور مسلمانوں کو نئی روح اور غذا ملی، حضرت کے انہیں تجدیدی

کارناموں سے ماضی قریب کی اسلامی تاریخ کے صفحات روشن ہیں، آپ کی ہمہ جہت اصلاح اور تجدیدی زندگی کے بارے میں آپ کے خلیفہ ارشد اور شہرہ آفاق اسلامی مورخ علامہ سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:

''اصلاح امت کی کوششیں علمی اور عملی زندگی کے ہر گوشے پر ان کی نظر تھی، بچوں سے لے کر بوڑھوں تک، عورتوں سے لے کر مردوں تک، جاہلوں سے لے کر عالموں تک، خانقاہوں سے لے کر صوفیوں درویشوں اور زاہدوں تک، غریبوں سے لے کر امیروں استادوں اور مدرسوں تک، غرض ہر صنف امت اور ہر جماعت کے کاموں تک ان کی نظر دوڑی، پیدائش، شادی بیاہ، غمی اور دوسری تقریبوں اور جماعتوں تک کے احوال پر ان کی نگاہ پڑی اور شریعت کے معیار پر جانچ کر ہر ایک کا کھرا اور کھوٹا الگ کیا اور رسوم بدعات اور مفاسد کے ہر روڑے اور پتھر کو صراط مستقیم سے ہٹایا، تبلیغ، تعلیم، سیاست معاشرت، معاملات، اخلاق، عبادات اور عقائد میں دین خالص کی نظر میں جہاں کوتاہی نظر آئی اس کی اصلاح کی، فقہ کے نئے نئے مسائل اور مسلمانوں کی نئی نئی ضرورتوں کے متعلق پورا سامان مہیا کر دیا اور خصوصیت کے ساتھ اس فن احسان وسلوک کی جس کا مشہور نام ''تصوف'' ہے تجدید کی، اس لئے مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری بھی آپ کو تصوف کا مجدد مانتے تھے، آگے چل کر علامہ سید سلیمان ندویؒ مزید فرماتے ہیں کہ:

''ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے ایک گوشہ میں ایک دوربیں، زندہ دل، مرد درویش بیٹھا ہوا مسلمانوں کے سارے احوال اور انکی زندگی کے ہر شعبے پر نظر ڈال کر حق و باطل، نیک اور بد صحیح اور غلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا، اس کے سامنے دین کی صحیح مثال تھی اور اس کو دیکھ کر موجودہ مسلمانوں کی زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں وہ ان کے درست کرنے میں مشغول تھا، اس نے پوری زندگی اس میں

صرف کی کہ مسلم کی تصویر حیات اس شبیہ کے مطابق بنادے جو دین حق کے مرقع میں نظر آئے۔(جامع دین، ص:۲۸،۲۷)

مسلمانوں کے احوال وکوائف اور انکے مصائب وآلام نے حضرت تھانویؒ کے دل دردمند اور فطرت ارجمند کو بے چین کر رکھا تھا، اسلام کے تئیں آپ کی فکرمندی اور مسلمانوں کے بارے میں جگرسوزی آپ کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، یہی درد آپ کے جسم اور قوئ فکر میں اس طرح جذب ہوگیا:

شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم

شفقت علی الخلق اور اصلاح المسلمین کی فکر کے بارے میں آپ کی مجلس کے شہرہ آفاق مذہبی اسکالر حضرت مولانا محمد شفیع عثمانی سابق مفتی اعظم پاکستان تحریر فرماتے ہیں کہ:

''جہاں مسلمانوں پر کوئی مصیبت آتی یا کسی پریشانی کی خبر آتی وہ غم میں اس طرح گھلنے لگتے تھے جیسے کسی شفیق باپ کی صلبی اولاد پر کوئی مصیبت آئی ہو''۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ بیک وقت عالم باعمل، محدث ومفسر، خطیب ومقرر اور فقیہ کامل تھے،آپ نے اسلام اور مسلمانوں کے عقدہائے لاینحل مسائل کی گرہ کشائی فرما کر اپنی دور اندیشی علمی اور شاہکار فقہی بصیرت کا ثبوت پیش کیا، خانقاہ امدادیہ سالکین علوم ومعرفت اور شائقین علم وادب کا مرجع بن گئی، وقت کے بڑے بڑے علماء صلحاء، ادباء، دانشور اور سیاسی وسماجی قائدین محض لوجہ اللہ مئے نوشی کے آداب سیکھنے قریب وبعید کی حد بندیوں کو چیرتے ہوئے کشاں کشاں حضرت کے دربار میں حاضر ہوکر بامراد لوٹتے،مشہور ادیب اور گل سرسبد مولانا سید سلیمان ندویؒ جن کے فضل وکمال اور تبحر علمی کے شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم بھی معترف تھے،حضرت تھانویؒ کے اسیر بن کر رہ گئے،مولانا عبدالباری ندویؒ حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ سابق مہتمم

دارالعلوم دیوبند، مفتی محمد شفیع عثمانی سابق مفتی اعظم پاکستان، خواجہ عزیز الحسن مجذوب وغیرہم فیضان اشرف کے پروردہ تھے، الحاد وتشکیک کی گم کردہ راہوں میں بھٹکنے والے شگفتہ اور شائستہ ادیب وناقد اور حضرت تھانویؒ کے خوان سے خوشہ چینی کر چکے، مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم ارقام فرماتے ہیں کہ:

''میری سیرت سازی میں سب سے زیادہ معین وموثر دو شخصیتیں ثابت ہوئیں، ان دونوں کو کہنا چاہئے کہ زندگی کا رخ ہی موڑ دیا ان دونوں کا فیض صحبت نصیب نہ ہوتا تو خدا معلوم کہاں کہاں اب تک بھٹکتا پھرتا''۔

واضح رہے کہ حضرت شیخ الہند کے شاگرد مولانا محمد علی جوہر (کامریڈ والے) سے بھی مولانا دریابادی متاثر ہوئے تھے، مولانا تھانوی واقعۃ مجدد ملت اور حکیم ودانا تھے ،آپ کی نگارشات اور علوم وفنون کی لطیف بحثیں دستاویزی حیثیت اختیار کر چکی ہیں، اس مجدد وقت کے فیضان ایمانی وروحانی سے اردو لٹریچر بھی دین مبین کی حیات افروز دولت سے مالا مال ہوگیا اور اس کا وقار ومعیار معتبر ومستند ہوگیا، یہی وجہ تھی کہ جب آپ نے بیان القرآن جیسی شاہکار تفسیر تصنیف فرمائی اور بخاری وقت حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے قرآن کریم کی اس تفسیر کو دیکھا تو بے ساختہ فرمایا:

''میں سمجھتا تھا کہ اردو میں یہ تفسیر عوام کے لئے ہوگی مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے''۔ آپ کی تصنیفات کم وبیش ایک ہزار سے متجاوز ہیں اور ہر ہر تصنیف اپنے اندر عجیب وغریب نکات اور نوٹس سمیٹے ہوئے ہے یہ تعداد محتاط انداز کے مطابق ہے ورنہ موجودہ وقت کے ایک مشہور عالم دین اور عارف باللہ حضرت مولانا ذوالفقار نقشبندی مدظلہ ''علماء دیوبند کا تاریخی پس منظر'' نامی کتاب میں فرماتے ہیں کہ حضرت تھانویؒ پر پی ایچ ڈی کرنے والے ایک اسکالر نے حضرت تھانویؒ کی کتابوں کی مجموعی

تعداد اٹھائیس سو بتائی ہے، ظاہر ہے علوم و معارف کا یہ گنج ہائے گراں مایہ کسی مجدد وقت کے قلم کا ہی رہین منت ہوسکتا ہے، حضرت تھانویؒ کی خوبی یہ ہے کہ آپ دقیق اور ثقیل عبارت لانے سے حتی الوسع اجتناب فرماتے ہیں، آپ کا اسلوب بیان نہایت دلکش اور سہل ہوتا ہے، طرز استدلال کا جواب نہیں، ایجاز و اختصار اعتدال اور توازن کی حد سے باہر نہیں، آپ جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کے مالہ و ما علیہ کا صحیح ادارک کرکے زیر بحث موضوع اور اس کے متعلقات پر جامع اور سیر حاصل بحث کرتے ہیں، عقلی اور نقلی مسائل کی تفہیم و تشریح ایسی کہ سر دھننے کو دل چاہتا ہے، آپ کا کلام حکیمانہ باتوں سے عبارت ہوتا ہے اور قاری کو اس طرح اپیل کرتا ہے کہ انکار وعناد کی کوئی سبیل نہ رہے، خلاصہ کے طور پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت تھانویؒ نے مسلمانوں کو نت نئے مسائل سے آگاہ کرتے ہوئے ان کو علمی، فکری اور مذہبی بلندیوں کی معراج کرائی ہے، یہاں یہ لکھنا بے جا نہ ہوگا کہ اس ناقص اور نامکمل مضمون میں حضرت تھانویؒ کی تحریری اصلاحی اور تجدیدی خدمات کا احاطہ ناممکن ہے، صرف اس کے بعض گوشوں پر اچٹتی اور طائرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔

بالآخر علم وعمل، شریعت وطریقت، طہارت وتقویٰ اور زہد واستغناء کا یہ بے پیمبر اور نور ونکہت کا یہ سخن ور ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو کرہ ارض پر نمود ہوا اور نصف صدی تک ایوان بدعت و دہریت میں اسرار وشریعت کی قندیلیں روشن کرکے اور اصلاح وفلاح دین کے قمقمے جگمگا کر ۱۹ / ۲۰ / ۱۹۴۳ء جولائی کی درمیانی شب کو ہمیشہ کے لئے آخرت کی طرف غروب ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

نماز جنازہ آپ کے بھانجے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نے پڑھائی اور ہزاروں عقیدت مندوں اور سوگواروں کی موجودگی میں خانقاہ کے شمال میں منوں مٹی کے نیچے آپ کو سلا دیا۔

آسماں لحد پہ ان کی شبنم افشانی کرے

(یہ مضمون حسن تدبیر دہلی کے حکیم الامت نمبر اکتوبر ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا)

خانوادۂ قاسمی کے گل سرسبد

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ

گذشتہ ڈیڑھ سوسال سے برصغیر ہندو پاک میں اسلامی فکر وانقلاب کیلئے تحریک دیوبند ایک تابندہ عنوان بن چکی ہے، دنیا کا شاید ہی کوئی اسلامی خطہ ہو جس نے دیوبند کے مہکتے گلشن سے خوشبو مستعار نہ لی ہو، ہندوستان کے اس علم وعمل کے سرچشمہ نے تحریک شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے تسلسل کو پوری دیانت وصیانت اور صداقت کے ساتھ باقی رکھتے ہوئے حق وایقان کے متلاشیوں کو سیراب کیا اور دین وایمان کے متزلزل قلعوں کو دوام واستحکام بخشا، چنانچہ آج بھی یہاں سے دین حنیف اور صراط مستقیم پر مر مٹنے کا شیر درس اسلام کے سپاہیوں اور جانبازوں کو دیا جارہا ہے اور ان شاء اللہ تا صبح قیامت بلا خوف لومۃ لائم یہ درخشاں سلسلہ جاری رہے گا۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن   پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

یہی دینی واسلامی تحریک جسے دارالعلوم دیوبند سے موسوم کیا گیا اور جو اسلام پسندوں کی چھاؤنی ہے، اپنی آغوش میں ایسی عہد ساز شخصیات کو جنم دیتی رہی ہے جن کے مثالی کارناموں سے تاریخ کے اوراق اٹے پڑے ہیں، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، فخر المحدثین حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ التفسیر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہم اسی تحریک کے پروردہ ہیں رحمہم اللہ رحمۃ واسعۃً۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ ان اکابر علماء اور بزرگوں کی آخری نشانی اور ان کی دینی نسبتوں وافکار کے جامع تھے، قاری محمد طیب کی پاکیزہ اور علمی زندگی

کے نقوش قابل رشک ہیں جن کا سمیٹنا کاتب الحروف جیسے بے بضاعت شخص کے بس کی بات نہیں ان کی مکمل شخصیت کے خدوخال کو اجاگر کرنے کیلئے سیال قلم اور ہزاروں اوراق کی ضرورت ہے۔ ع

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

تاہم ان کی جامع الجہات شخصیت کے بعض گوشوں پر ایک اجمالی خاکہ پیش خدمت ہے، آپ کی بلند پایہ شخصیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں مشہور عالمِ دین اور دارالعلوم دیوبند کے بالواسطہ فرزند جلیل فقیہ زمن مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ کا ایک اقتباس مستعار لینا ہوگا، فرماتے ہیں کہ:

''حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی نور اللہ مرقدہ کی ذات گرامی دارالعلوم دیوبند کے اس بابرکت دور کی دلکش یادگار تھی جس نے حضرت شیخ الہندؒ، حضرت حکیم الامت تھانویؒ، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور ان جیسے دوسرے حضرات کا جلوۂ جہاں آرا دیکھا تھا، ظاہر ہے جس ہستی کی تعلیم و تربیت میں علم و عمل کے ان مجسم پیکروں نے حصہ لیا ہو، اس کے اوصاف و کمالات کا ٹھیک ٹھیک ادراک بھی ہم جیسوں کیلئے مشکل ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ حضرت حکیم الاسلام قدس سرہ کے پیکر میں معصومیت، حسن اخلاق اور علم و عمل کے جو نمونے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں ان کے نقوش دل و دماغ سے محو نہیں ہو سکتے''۔

حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب ۱۳ر دسمبر ۱۸۹۷ء کو حضرت مولانا حافظ محمد احمد نانوتویؒ کے گھر قصبہ دیوبند میں پیدا ہوئے، آپ کا تاریخی نام مظفر الدین ہے جس سے ہجری سنِ ۱۳۱۵ھ نکلتا ہے، آپ کے دادا دارالعلوم دیوبند کے بانی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دیوبند ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی، آپ نے اپنی تعلیم کا آغاز

دارالعلوم دیوبند سے ہی کیا اور عمر کے ساتویں سال میں آپ نے قرآن کریم حفظ کرلیا، قاری عبدالواحد صاحبؒ سے مشق بھی کی، آپ کی تقریب بسم اللہ میں حضرت شیخ الہندؒ، مفتی عزیزالرحمن عثمانی، مولانا حبیب الرحمان عثمانیؒ اور مولانا محمد احمدؒ جیسے اکابر اور اساطین علم نے شرکت کرکے اس نیک بخت کو اپنی دعاؤں سے نواز، آپ نے مکمل تعلیم دارالعلوم دیوبند ہی میں حاصل کی اور دارالعلوم کے نابغہ روزگار اساتذہ سے کسب فیض کیا، ۱۹۱۸ء میں آپ دارالعلوم سے فارغ ہوگئے، روحانی فیوض وبرکات سے مستفید ہونے کیلئے حضرت تھانویؒ سے وابستہ ہوگئے اور سلوک واحسان کی سیڑھیاں طے کیں، علاوہ ازیں آپ کو عارف باللہ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت وخلافت حاصل تھی، خانقاہ رائے پور سے آپ نے پورا پورا فیض اٹھایا اور بامراد ہوئے، رسمی تعلیم وتعلم سے فراغت حاصل کر کے آپ نے دارالعلوم سے تدریس کا آغاز کردیا، آپ کو درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کیلئے مختصر سا وقت ملا، اس لئے کہ نوعمری ہی میں دارالعلوم کے ارباب بست وکشاد نے منصب اہتمام کیلئے آپ کو چن لیا، ظاہر ہے کہ دارالعلوم دیوبند جیسے مرکزی اور شہرۂ آفاق ادارہ کا اہتمام سنبھالنا جوئے شیر لانا تھا، مگر اللہ کے اس بندہ نے دارالعلوم دیوبند کے اس منصب کی نہ صرف لاج رکھی بلکہ بین الاقوامی سطح پر اس کو متعارف کرایا۔

آپ دارالعلوم دیوبند کے معمار ثالث تھے، انہیں کے زمانۂ اقتدار میں دارالعلوم کی عالم گیر شہرت ہوئی اور عالمی سطح پر دارالعلوم کو نقطۂ عروج حاصل ہوا، آپ کی غیر معمولی ذکاوت وذہانت اور انتظامی صلاحیت کا اندازہ اجلاس صد سالہ منعقدہ ۱۹۸۰ء سے بھی لگایا جاسکتا ہے، جس میں ہندوستان کی وزیر اعظم اندرا گاندھی سمیت ملکی وغیر ملکی سرکردہ شخصیات نے شرکت کرکے دارالعلوم کو خراج عقیدت پیش کیا اور دارالعلوم کی وسیع علمی، دینی، فکری، تدریسی، قومی، ملی اور تصنیفی خدمات جلیلہ کو سراہا مگر افسوس کہ اس صد سالہ

اجلاس کو نگاہ بد لگی اور آپ کی اخیر زندگی میں ایسا قضیۂ نامرضیہ پیش آیا کہ جس نے قاری صاحبؒ کے بے چین دل کو تڑپا دیا، کاش یہ حادثہ فاجعہ پیش نہ آتا، بہر کیف اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ خانوادۂ قاسمی و مدنی نے تمام تر واقعات کو پس پشت ڈال کر اس قضیہ پر خط تنسیخ پھیر دیا اور نسل نو کے لئے یہ پیغام دیا کہ قوت و مضبوطی اتحاد و یگانگت کی صورت ہی میں ممکن ہے۔

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ جیسا کہ ذکر کیا، علم و عمل، دین و شریعت، سیرت و کردار اور فکر قاسمی کے نقیب تھے، موصوف نے تحریراً ملک و ملت کی بیش بہا خدمات انجام دیں، آپ نے قومی اور ملی مسائل کے حل کیلئے مفید تر کوششیں کیں، اتحاد واتفاق اور بقائے باہمی کیلئے وہ آخری دم تک کوشاں رہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسا مشترکہ پلیٹ فارم آپ کی دینی تڑپ اور ملی بیداری کا بین ثبوت ہے، اس پلیٹ فارم سے بھی آپ نے اتحاد کی قندیلیں روشن کر کے فرقہ پرستوں کو لرزہ براندام کر دیا، ملک کے لئے بھی ہمیشہ نیک نامی کے اسباب تلاش کئے، ان کے مختلف خطوط سے جو کہ بیرون ممالک کے سربراہان کو لکھے گئے ہیں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ملک کے لئے کیا کرنا چاہتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ قاری صاحب جیسے لوگ صدیوں کے بعد اس دنیا میں قدم رنجہ ہوتے ہیں، اللہ نے آپ کو خصوصی کمالات و امتیازات سے نوازا تھا، آپ کی کسبی اور وہبی صلاحیتوں نے آپ کے اساتذہ کا دل جیت لیا تھا، یہی وجہ تھی کہ آپ ہندوستان سے پاکستان چلے گئے، تو شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ نے وزیر اعظم ہند سے خصوصی سفارش کر کے قاری صاحب کے ہندوستان واپس آنے کا راستہ ہموار کیا، زندگی کے ہر گوشہ میں آپ نے کام کیا، مختلف مکاتب، دینی تحریکات اور دانشگاہوں کی نگرانی و سرپرستی کے باوجود آپ نے تقریر و تحریر کے ذریعہ ملت اسلامیہ کی آبیاری کی، گویا کہ وہ

ہر ایک کے افادہ کے لئے کوشاں رہے

میں چمن میں جہاں بھی رہوں   میرا حق ہے فصل بہار پر

دیوبندیت کی ایسی جامع تشریح وتفہیم فرمائی کہ بہت سے گم کردہ راہ رشد وہدایت سے ہم کنار ہوئے، آپ کی بیش قیمت تصانیف آج بھی حلقۂ علم وادب کیلئے ایک وقیع خزانہ ہے، جس سے فکروفن کے شیدائی اپنی علمی پیاس بجھارہے ہیں، آپ کی متعدد تصانیف منصۂ شہود پر جلوہ گر ہیں جن میں تعلیمات اسلامی اور مسیحی اقوام، اسلام کا اخلاقی نظام، التشبہ فی الاسلام، اسرائیل کتاب وسنت کی روشنی میں، فطری حکومت، اصول دعوت واسلام، انسانیت کا امتیاز، ایک قرآن، شان رسالت، علماء دیوبند کا دینی رخ اوران کا مسلکی مزاج جیسی شاہ کار خالص علمی اور تحقیقی کتابیں آپ کے تصنیفی ذوق کو واکرتی ہیں، آپ کو ادبی ذوق کا بھی وافر حصہ ودیعت ہوا تھا، شعروشاعری کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی، چنانچہ آپ کا مجموعہ کلام عرفان عارف کے نام سے طبع ہو چکا ہے، اسی طرح ''آنکھ کی کہانی'' آپ کے ادبی ذوق پر شاہد عدل ہے، مشہور ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی نے آپ کی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے مکتوب میں لکھا ہے کہ:

''آنکھ کی کہانی'' آں محترم کا عطیہ یہاں آتے ہی پڑھ ڈالی، سبحان اللہ ماشاء اللہ ! مجھے علم نہ تھا کہ آپ کو شعرونظم پر بھی اس درجہ قدرت حاصل ہے، ذلک فضل اللہ کیا کیا قافیے نکالے ہیں، کیسے کیسے مضمون باندھے ہیں کہ پیشہ ور شاعروں کے بھی چھکے چھوٹ جائیں، نہ کہیں جھول نہ اتنی طویل نظم میں کہیں آورد بس آمد ہی آمد ہے، خوش دماغ تو بحیثیت ایک سچے قاسم زادہ کے آپ تھے ہی اب معلوم ہوا کہ ماشاء اللہ خوش فکر بھی اسی درجہ ہیں''۔

اسی طرح آپ کی خطابت بھی بے نظیر تھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور امیر شریعت

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ آپ کی خطابت پر عش عش کرتے تھے، آپ کسی بھی موضوع پر بولتے تو حق ادا کر دیتے، بس آمد ہی آمد ہوتی تھی، آپ کی خطابت کے سحر انگیز جواہر پارے خطبات حکیم الاسلام کے نام سے طبع ہو چکے ہیں (اور اب تو الحمدللہ سیڈیز کی شکل میں بھی موجود ہیں جن کی رونمائی حکیم الاسلام عالمی سیمینار منعقدہ ۱۵ر ۱۶ر ۱۷ر نومبر کے موقع پر ہوئی)۔

جن لوگوں نے حضرت قاری صاحب کی تقریریں بگوش ہوش سنی ہیں ان کا بیان ہے کہ قاری صاحب آج کے خطباء کی طرح نہ فقرے چست کرتے نہ جوش وخروش نہ پر تکلف لسانی، نہ خطیبانہ ادائیگی بلکہ اونچے درجے کے عالمانہ اور عارفانہ مضامین نہایت سہل انداز میں بیان فرما دیتے تھے کہ ہر عام وخاص برابر مستفید ہوتا۔

بہرکیف قاری صاحب اپنی گوناں صفات اور خصوصیات کی وجہ سے زندہ دلوں پر حکمرانی کرتے رہیں گے اور تاریخ کے اوراق میں آپ زندہ رہیں گے۔

(بہ شکریہ آئینہ مظاہر علوم سہارنپور، بابتہ ماہ اگست ۲۰۰۹ء)

آئی جو ان کی یاد تو آتی چلی گئی

صحافی و ادیب مولانا ازہر شاہ قیصر

عالم اسلام کی مقبول ترین اور پر شکوہ دینی و علمی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے چشمۂ صافی سے سیراب ہونے والے ارباب فضل وکمال کی وقیع اور گراں قدر ہمہ جہت خدمات سے تاریخ کے اوراق روشن ہیں، اللہ کے ان محبوب بندوں نے کیسے کیسے کارہائے نمایاں سرانجام دیے اور بسا اوقات تو اپنی قیمتی جانوں کی بھی پرواہ نہیں کی، آج وقت ہے انہیں یاد کرنے ان کے جاری کردہ علمی، تحقیقی، تدریسی، تصنیفی اور تعلیمی مشن کو آگے بڑھانے کا بلاشبہ ان کی یادوں کے چراغ بھی یونہی جلتے رہیں گے، لیکن ان کی بھولی بسری یادوں سے کہیں زیادہ ان کے معارف و مآثر کو عملی شکل دینے کی مخلصانہ کوشش درکار ہے، تاکہ قحط الرجال کے اس دور میں دین و مذہب کے سچے ترجمان اور قوم وملت کے تعمیری کاز کو اسلامی نقوش وخطوط پر گامزن رکھنے والے ارباب بصیرت تیار ہوسکیں، یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند نے اپنے فرزندوں کو دین وعمل اور فکر ونظر کی غیر معمولی دولت سے ہمیشہ آراستہ کیا ہے، یہاں کے مستحکم نظام تعلیم وتربیت سے پروان چڑھنے والے ملت کے فرزانوں کی ایک طویل فہرست ہے جو فکراً ولی اللہی اور مسلکاً قاسمی ورشیدی تھے، مگر اس فہرست میں محدث بھی ہیں، مفسر بھی، مجاہد و متکلمین بھی، راہ سلوک کے شہ سوار بھی ہیں، وعظ وخطابت کے دھنی بھی اور صحافت وقلم کے بے تاج بادشاہ بھی، غرض یہ کہ ان کی خدمات اور دلچسپیوں کے محاذ و میدان الگ الگ ہیں، ان شخصیات میں ہر صاحب فضل وکمال اپنی مستقل تاریخ رکھتا ہے اور ان کی زندگی وخدمات

کے عناوین مستقل پی ایچ ڈی کا موضوع بن سکتے ہیں، درحقیقت ان حضرات نے اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر دین وسیاست اور زبان وادب کی بےلوث خدمت کی ہے۔

اللہ غریق رحمت کرے ہمارے اس جانباز اور میدانِ صحافت وادب کے بے تاج بادشاہ کو جس کی پوری زندگی تعمیری صحافت کی آئینہ دار تھی اور جس نے رسالہ دارالعلوم دیوبند کے وقار میں خوش گوار اضافہ کیا، وہ بیدار مغز صاحبِ قلم ایک عرصہ بیت رہا ہے کہ اجنبی شہر کا باسی ہے۔

کاتب الحروف نے انہیں دیکھا تو نہیں لیکن انہیں پڑھا ضرور ہے، ان کی بولتی تحریریں اس بات کی قوی شہادت ہیں کہ وہ دبستان دیوبند کے دریتیم تھے، ان کا دلکش اسلوب نگارش، پرشوکت زبان اور عقلی ونقلی مسائل پر ان کا بے لاگ نقد وتبصرہ ان کی دلکش وبے باک صحافت کا تابندہ عنوان ہے، لوگ اور دنیائے صحافت انہیں ابن الانور مولانا ازہر شاہ قیصر کے نام سے جانتی ہے، ان سے کسبِ فیض کرنے والے اہل قلم کا ایک حلقہ آج بھی موجود ہے۔

مولانا ازہر شاہ قیصر پختہ کار ادیب اور شگفتہ قلم کار تھے، ان کے یہاں ادبی تحریروں میں زبان وبیان کے نئے پیرہن دیکھنے کو ملتے ہیں، جب وہ کسی حساس موضوع یا عنوان پر تنقیدی وتجزیاتی بحث کرتے ہیں تو نہایت خوب صورتی سے اسے کھنگال ڈالتے ہیں، آب دار موتیوں کی تلاش ودریافت ان کا فطری ذوق ہے، خواہ اس کے لئے انہیں کتنی ہی غواصی کیوں نہ کرنی پڑے، لیکن اس کوشش میں ظفر یابی ان کے قدم چومتی اور چٹکیوں میں اس مہم کو وہ سر کر لیتے ہیں، انہوں نے اپنے پیچھے علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف کا ایک گنج ہائے گراں مایہ چھوڑا ہے، جسے پڑھ کر سر دھننے کو دل چاہتا ہے اور قاری عش عش کرنے لگتا ہے، وہ اپنی تحریر میں رواں اور سلیس نیز بامحاورہ تعبیر

استعمال کرتے ہیں، لفظی تکرار سے حتی الامکان پرہیز کرتے اور شگفتہ لب ولہجہ ان کے رشحات قلم میں پنہا ہوتا ہے، اسلامی موضوعات پر جب وہ لکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دینی رنگ وآہنگ ان کی گھٹی میں پڑا ہوا بلکہ ان کی عملی زندگی کا انعکاس ہے جو ان کا موروثی خزانہ ہے اور اس پر کوئی تعجب بھی نہیں اس لئے کہ وہ اس عظیم باپ کے فرزند ارجمند ہیں جن کی علمی رفعتوں اور اسلامی سوز وگداز کا اعتراف برصغیر کے علاوہ بیرونی دنیا کے مشاہیر اہل اسلام نے بھی کیا ہے، جس زمانہ میں مولانا سید ازہر شاہ قیصر نے دارالعلوم دیوبند کے ترجمان رسالہ دارالعلوم کی ادارت کی وہ معیاری صحافت اور علمی غلغلوں کا دور تھا مختلف ارباب فضل وکمال اور کہنہ مشق اہل قلم کی نکتہ آفریں تحریریں علمی حلقوں میں داد سخن اور خراج وصول کر رہیں تھیں، اردو کے قالب میں فکر وتحقیق اور علمی وادبی مضامین نے سنہرے موتی ٹانک دئے تھے، مولانا ازہر شاہ قیصر کیلئے یہ دور پرخطر تھا، خصوصاً اس لئے بھی کہ وہ اسلامی تحریک کے عظیم مرکز دارالعلوم کے ترجمان تھے، ان کی ذراسی بھی قلمی لغزش سے مادر علمی کا وقار داؤں پر لگ سکتا تھا اور حزب مخالف اس سے لایعنی اور غیر موزوں بحثوں کو جنم دے سکتا تھا مگر قلم کے اس سپاہی نے دارالعلوم کی عظمت پر آنچ تک نہیں آنے دی بلکہ وہ نہایت بیدار مغزی اور خداداد بصیرت سے رسالہ دارالعلوم کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

وہ خوب لکھتے اور پڑھتے تھے، ہندوپاک کے تمام وقیع اور معتبر مجلات واخبارات میں ان کے علمی مضامین اور مآثر اہتمام سے شائع کئے جاتے تھے، خشک سے خشک موضوع پر بھی انہیں لکھنے اور تبصرہ کرنے کی بھرپور مہارت وقدرت تھی، اپنے وقت کے ممتاز علماء، ادباء، شعراء دانشوران اور اسکالروں کی نظر میں وہ قابل احترام تھے اور ان سے مراسلت ومذاکرہ کرنے میں دلچسپی دکھاتے تھے، اس کا اندازہ رسالہ دارالعلوم

کے قدیم فائلوں سے بخوبی ہوتا ہے۔

راقم نے پہلے بھی لکھا کہ وہ پرشوکت زبان اور عمدہ تعبیر واسلوب میں اپنے افکار کا اظہار کرتے تھے، ان کا مشاہدہ غضب کا ہے، لفظی صنعتوں اور دلکش پیرایہ بیان میں وہ اپنے مشاہدہ اور واقعہ کی تصویر سازی میں غیر معمولی درک رکھتے ہیں، مشاہدہ کو بیان کرنے میں انہیں بلا کا فن آتا ہے اور اس باب میں وہ اپنے معاصرین پر بھاری ہیں، ان کے قوت مشاہدہ کا نمونہ ذیل کی تحریر میں دیکھئے:

''میں پلٹ کر دوسرے زینے سے دفتر اہتمام میں آنے لگا تو درمیان میں دارالحدیث کی بالائی منزل کی لمبی چوڑی گیلری سے گذرا دارالعلوم میں یہ وہی جگہ ہے جہاں خبر نہیں مولانا عثمانی کتنی دفعہ تقریر کر چکے ہیں، گیلری سے گذرتے ہوئے مجھے دارالحدیث سے صاف آواز سنائی دی کہ سکون وراحت انسانی زندگی کے سب سے بڑی دشمن ہیں، ممکن ہے کہ سانپ انسان کا سب سے بڑا دشمن ہوتے ہوئے بھی کسی وقت انسان سے اچھا سلوک کرے اور اسے کاٹ لینے سے رک جائے، یا ہوسکتا ہے کہ زہر انسان پر اثر نہ کرے اور انسان زہر کھا لینے کے بعد بھی زندہ رہے، مگر ایسا ہو نہیں سکتا کہ جو قوم اور جو طبقہ تن آسانی اور راحت پسندی کا خوگر ہو جائے اور جہد وکشمکش سے جان چرانے لگے، اسے قدرت عزت کی کوئی زندگی اور زندگی کا کوئی ایک لمحہ بھی عنایت فرمادے، عیش طلبی اور انسانی زندگی کا باہم کوئی تعلق نہیں، زندگی میں عیش کا تصور وتلاش، انسان کے لئے ایک لاعلاج مرض ہے اور عیش وراحت کی موجودگی انسانیت کے ناموس وعزت کیلئے موت کا پیغام ہے۔

ہاں بھائی ازہر میاں نے تو ابھی اکبر الہ آبادیؒ کو بنیا اور اس کی شاعری کو بنیا پن کہا ہے، مگر مجھے تو ہمیشہ سے اکبر کی شاعری سے انس رہا ہے، سبحان اللہ! اس

موضوع پر اس نے کیسی اچھی بات کہی ہے (مولانا نے مجمع پر ایک تیز نظر ڈالی اور پھر بھاری اور پر شکوہ آواز میں فرمایا کہ

ہر چندہ بگولا مضطر ہے ایک جوش تو اس کے اندر ہے
ایک رقص تو ہے ایک وجد تو ہے بے چین سہی، برباد سہی

دارالحدیث کی گیلری سے گذرتے ہوئے اس وقت مولانا کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے، یہ صرف محویت تصور کا ایک کرشمہ تھا ورنہ یہاں دارالحدیث میں اب کہاں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور کہاں ان کی تقریر!''۔

شاہ جی نے تمام عناوین پر خامہ فرسائی کی ہے اور اپنے گھر بار قلم سے علم وادب کی مجلسیں سجائی ہیں، ان کی شخصیت کا اندازہ ان کے گراں قدر مضامین اور ادبیات عالیہ سے ہوتا ہے ان کے مآثر ومعارف کا ایک انسائیکلو پیڈیا ہے جس پر کام کرنے کی ضرورت ہے اور مولانا ازہر شاہ کے قلمی جانشین اور معروف صاحب قلم وزبان مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کافی عرصہ سے ادھر متوجہ ہیں، انہوں نے اپنے والدگرامی کی تحریروں کو وقتاً فوقتاً عمدہ کتابت وطباعت اور اہتمام سے شائع کیا ہے اور اس بابت ان کی کوششیں دیدنی ہیں، مگر ابھی بہت کام باقی ہے اور ان کے فیض یافتگان پر یہ قرض ابھی باقی ہے، بالخصوص وہ جماعت جن کے ساتھ وہ آخری دم تک شانہ بشانہ چلتے رہے اور یہاں کوئی مصلحت ان کے آڑے نہیں آئی، بندہ کا یہ احساس ہے جو غلط بھی ہوسکتا ہے کہ شاہ جی کو فراموش کردیا گیا، حالانکہ ان کی خدمات اس سے بالاتر ہیں۔

مولانا ازہر شاہ قیصر قلندرانہ شان رکھتے تھے انہوں نے کبھی مالی مفادات سمیٹنے پر توجہ نہیں دی وہ دیوبند اور دارالعلوم سے عشق کی حد تک لگاؤ اور وابستگی رکھتے تھے،

متعدد لوگ دیو بند سے باہر چلے گئے اور بسلسلۂ ملازمت وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے ،مگر ازہر شاہ قیصر کو دیو بند کی زمین نے الگ ہونے نہیں دیا ، وہ اگر چاہتے تو اپنی لیاقت وقابلیت کے سبب دیگر مرکزی مقامات پر بھی خصوصی مراعات حاصل کر سکتے تھے ،لیکن انھوں نے دیو بند اور دار العلوم کو ہمیشہ ترجیح دی ، بہ ہر کیف وہ اپنی گونا گوں خوبیوں اور زریں خدمات کے حوالہ سے یاد کئے جاتے رہیں گے، اللہ انہیں اپنے شایان شان اجر جزیل عطا کرے، آمین۔

(بہ شکریہ ترجمان دیو بند، بابتہ ماہ فروری، مارچ ۲۰۰۹ء)

ذکر سے جن کے خوشبو مہکے

حضرت مولانا مفتی مہربان علی بڑوتی ؒ

اس سرائے فانی دنیا میں موت وحیات کی کشمکش گردش شام وسحر کے ساتھ روز ازل سے جاری ہے، کروڑ ہا افراد اس بے ثبات دنیا میں نمودار ہوئے، جو اپنے مقام و منصب، خاندانی جاہ وجلال، مالی تفوق اور اقتصادی برتری میں لاثانی تھے۔ جن کے حین حیات ہر کس وناکس کو صحیح اور غلط کے درمیان خط امتیاز کھینچنے کا واجبی حق بھی نہ ملتا تھا۔ بلکہ ان کی خود ساختہ عظمتوں کے بادل نخواستہ طواف کئے جاتے تھے، ان کے شر سے بچنے کی خاطر عقیدت ومودت کی سلامیاں دی جاتی تھیں مگر جیسے ہی روح نے جسم سے بغاوت کی اور وہ راہی ملک بقا ہوئے تو اپنے بھی سب پرائے سے ہو گئے۔ اب نہ ان کا نام زندہ اور نہ وہ شان باقی رہی۔ عموماً یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں انسانیت کے تقاضوں اور سماجی اضطراب سے کوئی سروکار نہیں ہوتا یہ لوگ بس اپنے لئے ہی جیتے ہیں اور بے مقصدیت کا شکار ہو کر فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ چنانچہ نہ تو کوئی آنکھ ان کے انسانی قافلہ سے بچھڑنے پر اشک بار ہوتی ہے اور نہ کسی کا دل تھوڑا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس بعض وہ دلنواز ہستیاں بھی ہیں جو پس مرگ زندہ کہلاتی ہیں ان کے اس دنیا سے پردہ کناں ہونے کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فیض وبرکات کا سیل رواں بدستور ہے۔ لوگ ان کے نام کا دم بھرتے ہیں ان کی بامقصد زندگی سے روشنی حاصل کی جاتی ہے اور ان کا ذکر خیر زباں زد خاص وعام ہوتا ہے۔ ایسی ہی بافیض شخصیتوں کی فہرست پر جب نگاہ پڑتی ہے تو اس میں ایک نمایاں نام جناب حضرت مفتی مہربان علی بڑوتی علیہ الرحمہ کا نظر آتا ہے۔ جو تھے تو

ہماری ہی طرح مختصر سے گوشت پوست کا ایک ڈھانچہ۔ لیکن ان کے سینے میں اللہ جل مجدہ نے دل بیدار ودیعت فرمادیا تھا جو ذکر وفکر، تلاوت وتسبیحات اور یادالہی سے انرجی حاصل کرتا تھا۔ وہ ایک ولئ باصفا، شب زندہ دار، صوفی باکمال اور مربیانہ صفات کے حامل ایک قابل قدر انسان تھے۔ جن کی رگ حمیت میں ایمان وعقیدہ کی لہریں چمکتی تھیں۔ شریعت وطریقت جس کا فطری مزاج تھا۔ وہ اللہ کی سرزمین پر حجۃ الاسلام تھا۔ بھلا آج اگر ڈیڑھ دہائی گزرنے کے باوجود ان کے حادثہ کی کسک بالکل تازہ ہے۔ لوگ انہیں خراج تحسین پیش کررہے ہیں۔ اصحاب علم وقلم ان کے گلشن حیات سے بوئے عنبر مستعار لے رہے ہیں۔ اور ایک مرتبہ پھر ان کی یادوں کی ''دعوۃ الصدق'' کی شکل میں باضابطہ محفل سجا رہے ہیں تو یہ بھی ان کی بزرگانہ شخصیت کا ایک ادنی کرشمہ ہے ؂

یہ بلند رتبہ ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

مولانا مہربان علی کی ذات گرامی مجموعۂ اوصاف کثیر تھی۔ وہ بہت کم عمری ہی میں امتیازی خصوصیات کا پرتو دکھائی دیتے تھے اور ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات جیسا محاورہ مرحوم کی البیلی شخصیت کا موزوں ترین ترجمہ تھا۔ گو وہ خود کسی قابل تذکرہ علمی خانوادہ کا پس منظر نہیں رکھتے تھے۔ کہ جس کے سبب عظمت ونیک نامی تھوڑی سی مشق مزاولت ہی سے بعجلت تمام ان کے قدم بوس ہو جاتی ہے۔ بلکہ مولانا کے اس تیز گام سفر ترقی کی تفصیلات قابل رشک ہیں کہ اس بندۂ خدا نے محض ۴۳ رسال کے مختصر سے دورانیہ میں اپنی تعلیمی وتصنیفی سرگرمیوں کا ایک جہان روشن کرلیا تھا ؂

ایں سعادت بزور بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ظاہر ہے کہ یہ کسی ایک ہفتہ ماہ یا سال کی ریاضت ومجاہدہ کا صلہ نہیں تھا۔ بلکہ ان

کی کل زندگی کے بیشتر ماہ وسال از دیاد علم وکمال کی تحصیل وترسیل ہی میں صرف ہوئے ہونگے تب جاکر وہ قافلۂ سالار ٹھہرے تھے، بقول شاعر

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے میرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

یا دش بخیر ابھی رواں سال ۱۴۳۶ھ مطابق ۲۰۱۵ء کے ماہ ربیع الاول وجنوری کی کسی تاریخ میں ضلع مظفرنگر کی ایک معروف دینی درسگاہ مدرسہ بحرالعلوم کشن پور میں حضرت رئیس الجامعہ کے حسب ایماں ششماہی امتحان لینے کی غرض سے اپنے دیگر رفقاء مولانا عبدالواجد ندوی اور مولانا محمد ادریس ندوی کی معیت میں حاضری ہوئی، حضرت مفتی مہربان علیؒ کے نام اورکام سے یہ راقم آثم چونکہ دارالعلوم دیوبند کے زمانہ طالب علمی ہی سے واقف سا ہوگیا تھا جہاں قرب وجوار کے دیگر مشاہیر کے علاوہ مولانا کا نام بھی گاہے گاہے پردۂ سماعت پر دستک دیتا، جس سے ان کی رخصت پذیر شخصیت سے محبت کا نقش مزید گہرا ہوجاتا، اس لئے یہ تمنا بھی مزید انگڑائی لیتی کہ کیوں نہ ان کے علمی مآثر سے استفادہ کے ساتھ ساتھ مولانا مرحوم کی مشن کار دینی درسگاہوں کو بھی دیکھا جائے، ہماری دانست میں چونکہ اس سلسلہ کی سب سے موقر درسگاہ جامعہ اسلامیہ فلاح دارین تھی جہاں حضرت کے باختصاص خلفاء وشاگردان رشید مذکورہ درسگاہ کے پلیٹ فارم سے دین ودانش کے زمزمے بلند کرنے میں لیل ونہار کوشاں ہیں، بس یہی وہ غرض وغایت تھی جس نے کشاں کشاں ہمارے اس سہ رکنی قافلہ کو بلاسپور پہنچادیا۔ اس درمیان چونکہ حضرت کے میر منشی اور تحریر وقلم کے ترجمان محترم مولانا میر زاہد مکھیالوی سے فون پر رابطہ ہوچکا تھا، اس لئے وہ بھی اپنے ایک دور دراز سفر پر ہونے کے باوجود مدرسہ میں ہم خوردوں کی آمد کے مشتاق تھے، اوراس کی اطلاع انہوں نے جامعہ کے

ایک موقر استاذ و مفتی جناب مولانا محمد عابد یسع صاحب کو پیشگی دیدی تھی، الغرض ہم وہاں پہنچے تو خاصے مکانی رقبہ پر محیط مدرسہ کی خوبصورت بلڈنگ نظر آئی، دیکھا تو ہر چیز میں نظم وضبط اور سلیقہ مندی کا اظہار، مین گیٹ کے داخل دروازہ ہوتے ہی بائیں طرف دیواری مجلّات کا زریں سلسلہ جو عربی و اردو کے قالب میں تیار کر کے نہایت قرینہ سے آویزاں کئے تھے، جس سے طلبہ کی صحافتی دلچسپیاں صاف ہویدا تھیں، مدرسہ کے صحن اور اندرون میں صفائی ستھرائی کا نظم مثالی تھا، چمن بندی کی مسکراہٹیں اس پر مستزاد تھیں ،مزید آگے بڑھے تو اوپری منزل پر مختلف شعبوں کے دفاتر اور پرشکوہ لائبریری کے خوشنما مناظر نے دل موہ لیا، جہاں ہزاروں کتب کی موجودگی اور طلبہ کو مطالعہ کا پابند بنانے والا چارٹ ذمے داران مدرسہ کے ذوق سلیم کا غماز تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ جہاں سے بھی دیکھا تو دل نے گواہی دی کہ "جا ایں جا است" راقم الحروف کے ایک رفیق نے بروقت جب یہ کہا کہ یہ سب دراصل حضرت بڑوتی کی مربیانہ اداؤں کا ثمرہ ہے تو میرا ذہن ایک مرتبہ پھر اس ان دیکھی شخصیت کا سراپا قید تصور میں لانے لگا جس کے دم فیض سے علم وتصوف کی مجالس آباد تھیں، وہ جس نے کئی دہائیوں تک تعلیم وتربیت کے پھریرے اڑائے ، جو شبلی وجنید بایزید بسطامی جیسے اہل دل پرکھوں کی روایتوں کا طرح دار تھا، اس کے پاس مال وثروت کا وقتی ذخیرہ اگر چہ ندارد تھا۔لیکن علم وقلم کی لازوال حکمرانی بہرحال اس مرد درویش کو حاصل تھی، اس کے لمس میں عجیب سرشاری تھی، لوگ اس کی زیارت ودید کیلئے ٹوٹ پڑتے تھے، اہل ثروت اس کے شاہی دربار میں نیاز مندانہ حاضری کو سعادت سمجھتے تھے، وہ دوسروں کے لئے جیتا تھا۔اس کی دکان معرفت میں بیمار دلوں کیلئے شفایابی کا بہترین ٹانک موجود تھا، اس کے ظاہر و باطن میں تباین نہ تھا۔ اس کے شب وروز کی مصروفیتیں دیکھئے اور سوانح وحالات پر نگاہ ڈالئے تو حکمت وبصیرت

کے کیسے کیسے اسباق پڑھنے کو ملیں گے، خدمت دین کیلئے آہیں بھرنا مرنا اور مٹنا انہیں یاران باصفا کی سیرت وکردار سے سیکھنے کو ملتا ہے، ان کے جلو میں گفتار نہیں کردار کے سکے ڈھلتے تھے۔ وہ ہر دم مخلوق خدا کی فیض رسانی میں متحرک نظر آتے تھے، شب کی تاریکی اور برق وباد کی یم بہ یم آمد ان کے قدموں کو نشان منزل کی طرف بڑھنے سے مانع نہ ہوتی بلکہ وہ بے خوف وخطر اس احساس کے ساتھ آگے بڑھ جاتے کہ:

جس دن سے چلا ہوں میری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

یا پھر یہ جذبہ جنوں انہیں محو ترقی رکھتا ہے کہ:

گذر جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

فی الحقیقت حضرت مفتی مہربان علی کی شخصیت علم وانتظام اور اصلاح وتربیت کا مثالی نمونہ تھی ، ایسا لگتا ہے کہ مبدأ فیاض نے انہیں طاق صفت بنایا تھا۔ ان کی وہبی صلاحیتیں ان کی مستند شناخت کا معتبر حوالہ تھیں، عموماً ہوتا یہ ہے کہ شخصیتیں اداروں سے پروان چڑھتی ہیں اور وہی ان کے تعارف وتعریف کا ابلاغی وسیلہ قرار پاتی ہیں، بلکہ آجکل تو بنے بنائے اداروں کے ذریعہ شہرتوں کی دنیا بسا لینا عام بات ہے، جس سے حوصلہ پاکر کچھ نام نہاد رہبرانِ قوم وملت نے بھی خدمت دین کا دم بھرا ہے، لیکن ہمارے حضرت مفتی مہربان علی کا معاملہ بالکل ہی جداگانہ تھا۔ وہ ملک کی کسی بہت ممتاز درسگاہ سے انتساب نہ رکھنے کے باوجود اپنے روشن کارہائے نمایاں کے ایسے نقوش چھوڑ گئے ہیں جس سے ان کی یادوں کے چراغ ضوفشاں رہیں گے، بلاشبہ مولانا مہربان علیؒ دین وملت کے محسن اعظم تھے، علم وعمل سے عبارت ان کی مثالی زندگی سے ہمیں یہ پیغام ملتا ہے کہ

اخلاص وہمت کا سرمایہ اگر کسی کو فراہم ہو اور وہ دارین کی سعادتوں سے اپنی آنکھوں کو چکا چوند کرنا چاہتا ہے تو ذرا ہمت کر کے آگے بڑھے، طواف دشتِ جنوں کا سودہ اگر اس کے سر میں سمایا ہو تو وہ کل روز قیامت بھی ابرار واخیار کی معیت پانے میں کامران ہوگا اور گلشن انسانیت بھی اس کے تذکروں سے مہکتا رہے گا، کسی نے شاید آپ ہی کے لئے کہا ہے کہ

؎

آتی ہی رہے گی ترے انفاس کی خوشبو
گلشن تیری یادوں سے مہکتا ہی رہے گا

پدرانہ شفقتوں کے حامل مربی استاذ

حضرت مولانا قاری شریف احمد گنگوہیؒ

گنگوہ کی سرزمین مدت ہائے دراز سے دین ودانش اور علم وعرفان کی ان نادرۂ روزگار شخصیات کی مولد ومسکن رہی ہے جن کی حرارت آمیز ایمانی شعاؤں سے کفروشرک کے پرہول سناٹے کافور ہوئے اور تاریک زدہ مسلم معاشرہ کو روشنی نصیب ہوئی، اس بابرکت سرزمین پر جنم لینے والوں میں بعض ایسے خوش نصیب بھی ہوئے جن کی علمی اور روحانی زندگی سراپا سنت وشریعت سے عبارت اور یادالٰہی سے آباد وشاداب تھی اور وہ بجا طور پر اس شعر کی عملی تصویر تھے کہ:

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں میں اسی لئے نمازی

ماضی کے جھروکوں سے دیکھئے تو اسلام کی گذشتہ پانچ سوسالہ تاریخ میں سنت وشریعت کی ترویج واشاعت میں مستفیدین گنگوہ اور اس کے جیالوں کا نام سنہرے حروف سے لکھا نظر آتا ہے اور ان عشاق وعارفین باللہ اور کبار علماء کا تذکرۂ جمیل آتے ہی عقیدت والفت کے ملے جلے جذبات مچلنے لگتے ہیں، واقعی رب ذوالجلال نے اپنے دین کی صیانت وفروغ کیلئے ان اہل اللہ کو دل دردمند اور فکر ارجمند بخشا تھا ان کی دینی وایمانی بصیرت اور سدابہار پاکیزہ فکر وتربیت نے بہتوں کو قعر مذلت سے نکال کر ہمدوش ثریا کیا، ان انفاس قدسیہ میں اقطاب ثلٰثہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، حضرت شاہ ابوسعیدؒ اور فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ اسرارہم جیسے علم ودانش اور تصوف

وروحانیت کے فرزانے ودیوانے نظر آتے ہیں جن کی حیات وخدمات کا ہر پہلو روشن اور لائق اسوہ ہے، ان مشائخ عظام اور اہل دل علماء نے مردوں کی مسیحائی کچھ اس انداز سے کی کہ تاریخ کے صفحات ان کے کردار وعمل سے روشن ہو گئے۔

لیکن بیسویں صدی کے بالکل اوائل یعنی ۱۹۰۵ء میں فقہ وفتاویٰ اور تصوف وسلوک کی عبقری شخصیت امام ربانی عالم حقانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے وصال سے بالآخر علم وادب اور فقہ وتصوف کی وہ مجلسیں ویران اور سونی ہوا چاہتی تھیں جہاں شمع محمدیؐ کے دیوانے پروانہ وار جمع رہتے تھے حتیٰ کہ دار العلوم ومظاہر علوم جیسے کلیدی اداروں کے سرخیل اور تدریس واہتمام کے مقتدر اصحاب فضل وکمال نیاز مندانہ حاضری دیا کرتے تھے، جن میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری، حضرت مولانا یحییٰ کاندھلوی، حضرت مولانا الیاس بانیٔ تبلیغ، حضرت مولانا مرتضی حسن چاندپوری، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا صدیق احمد انبہٹوی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم جیسے اساطین علم وفن نے تو باقاعدہ حضرت گنگوہیؒ کے خوان علم سے خوشہ چینی کی ہے
۔

چنانچہ حدیث وفقہ اور روحانیت کی اتنی عظیم درسگاہ قریب تھا کہ بالکل ختم ہو کر رہ جاتی اور اپنی عظمت رفتہ کی صرف ایک داستان بن جاتی جس طرح بخاریٰ وسمرقند آج حسرت ویاس کے کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے ہیں، لیکن حق جل مجدہ کو اس مقدس سرزمین سے پیار تھا اور اس سے کام لینا تھا ویسے بھی نہ معلوم کتنی پیشانیاں اس سرزمین کی شادابی کیلئے اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوئی ہوں گی، چنانچہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اسلاف کی اس گرانمایہ امانت کی نئی نسل میں محفوظ منتقلی کیلئے حضرت مولانا قاری شریف احمد نور اللہ مرقدہ نے ۱۳؍ اگست ۱۹۲۸ء بروز دوشنبہ کو جناب حافظ حبیب احمد صاحب

گنگوہیؒ کے یہاں ایک دینی گھرانہ میں آنکھیں کھولی، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی جبکہ حفظ کی تکمیل حضرت گنگوہیؒ کے خاص تربیت یافتہ حافظ عبدالرحمن بن عبدالرحیم کے پاس کی، بعدازاں تجوید وقرأت کیلئے سہارنپور تشریف لائے جہاں قاری عبدالخالق صاحبؒ سے تجوید وقرأت میں اختصاص پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کو حدر ترتیل اور تدویر کے خوبصورت لب ولہجہ میں خوش الحانی کے ساتھ پڑھنے کے اندر کمال حاصل کیا، ادھر عربی کی تعلیم مظاہر علوم میں شروع ہوئی چند سال پڑھ کر آپ دیوبند آگئے جہاں تین سال بسلسلۂ تعلیم مقیم رہے اور ۱۹۴۹ء میں سند فراغت سے سرفراز ہوئے۔

حضرت قاری صاحبؒ نے مظاہر علوم کی طالب علمی کے زمانہ میں ہی دیوبند وسہارنپور کے بزرگوں اور اساتذہ کے مشوروں اور حکم پر ۱۹۴۴ء میں بنام خدا مکتب کی شکل میں جامعہ اشرف العلوم رشیدی کی داغ بیل ڈالی اور دارالعلوم دیوبند سے تعلیمی مراحل پورے کر کے مذکورہ ادارہ کی تعمیر وترقی میں رات دن کچھ اس طرح لگے کہ جامعہ بہت جلد تعلیم وتربیت کی مثالی دانش گاہ قرار پائی، عمدہ اور ٹھوس تعلیم کیلئے ماہر فن اساتذہ کرام کا تقرر کیا، شب وروز طلبہ کے تابناک مستقبل کی زلفیں سنوارنے انہیں ہر طرح سے آرام پہنچانے اور لائق وباصلاحیت بنانے کی فکر اور دوڑ دھوپ میں اس طرح گذر جاتے کہ اپنا بھی خیال نہ رہتا۔

اسی پختہ اور ٹھوس تعلیم وتربیت کے ماحول نے جید الاستعداد علم وعمل سے آراستہ فضلاء دین کو جنم دیا جو دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور جیسے عالم گیر شہرت کے حامل مرکزی اداروں میں تدریس وافتاء کے مناصب پر متمکن ہو کر اپنی مادر علمی کا نام روشن کر رہے ہیں اور بانئ جامعہ کی روح کو ٹھنڈک پہنچا رہے ہیں اللھم زد فزد۔

ایک مثالی مربی ومہتمم اور کامیاب منتظم کے اندر جو اوصاف ناگزیر ہوتے ہیں

وہ حضرت قاری صاحبؒ کے اندر علی وجہ الاتم موجود تھے، علم وعمل کے مرکز شہر گنگوہ کی دینی عرفانی اور روحانی شناخت کو باقی رکھنا اور اکابر علماء کی آرزوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا جوئے شیر لانے سے کیا کم تھا، اس پر مستزاد مضبوط قسم کے فتنہ پردازوں سے پالا پڑا مخالفتیں ہوئی مقدمات بھی قائم کرائے گئے اور اس بندہ خدا کو بہر صورت مجبوس کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی لیکن ان کا حوصلہ جوان تھا مضبوط اور فولادی عناصر سے آپ کی تشکیل ہوئی تھی، تعلق مع اللہ عبادت وریاضت اور دینی درد وکرب اور سحر خیزی وزندہ دلی کی تکبیر مسلسل نے انہیں دانائے روزگار بنادیا تھا، فیاض ازل نے انہیں فہم وفراست سے کچھ اس طرح ہم عناں کیا تھا کہ وہ زمانہ اور اپنے گردوپیش کے مدوجزر کو قبل از وقت تاڑ لیا کرتے تھے اسی لئے کہا گیا ہے اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ، چنانچہ بدخواہوں کے شاطرانہ حربے آپ کے سامنے تارعنکبوت ثابت ہوئے اور جامعہ اشرف العلوم کی شکل میں جو چراغ آپنے روشن کیا تھا الحمدللہ وقت اور ضرورت کے عین مطابق اس کی لو بڑھ رہی ہے:

بجھنے سے پہلے میں نے جلائے ہیں کئی چراغ
جاری ہے روشنی کا سفر میرے بعد بھی

حضرت مولانا قاری شریف احمد رحمۃ اللہ علیہ اکابر دارالعلوم ومظاہرعلوم کے منظور نظر تھے آپنے ان حضرات کی خدمت کرکے سب کے دل جیت لئے تھے اور ان کی مستجاب دعاؤں وبرکتوں کے حصول کو اپنا وظیفہ حیات بنالیا تھا، انجذاب الی اللہ کی کیفیت نے برکۃ العصر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ کے دست حق پر بیعت کرادیا کم وبیش چالیس سال شیخ کے وصال تک اصلاح وارشاد کا یہ زریں سلسلہ قائم رہا، حضرت شیخ بھی جامعہ اشرف العلوم سے تعلق خاطر رکھتے تھے چنانچہ مدینہ منورہ کی مقدس وادیوں سے اپنے

ایک خط میں ارقام فرماتے ہیں ''یہ ناکارہ آپ کے مدرسہ کیلئے اور آپ کیلئے بہت اہتمام سے دعا کرتا رہتا ہے اور آپ کی طرف سے روضۂ اقدس پر صلوۃ وسلام پیش کرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے تم لوگوں کی مدد فرمائے اور مدرسہ کو خلفشار سے بچائے آمین۔

بلاشبہ آج اگر جامعہ اشرف العلوم کا اپنے حسن انتظام، عمدہ تعلیم وتربیت اور زمانی ومکانی وسعتوں کے لحاظ سے ملک کے ممتاز اور نیک نام اداروں میں شمار ہوتا ہے تو اس میں حضرت قاری صاحبؒ کی جد وجہد اور اہل دل علماء واکابر کی مستجاب دعائیں اور نیک تمنائیں شامل ہیں فللہ الحمد۔

حضرت قاری صاحب علیہ الرحمہ کو اللہ رب العزت نے بے شمار اوصاف وکمالات اور خصوصیات ومیزات سے آراستہ کیا تھا ان میں صبر وشکر، توکل ورضاء، استغناء وقناعت پسندی، سلیقہ شعاری، جرأت وبسالت، ہمت واستحکام، عفوودرگذر، جگر سوزی دلیری، مہمان نوازی وانکساری جیسے متضاد اوصاف جمع ہو گئے تھے، حق بات کہنے اور حق بات سننے کا خوبصورت مزاج رکھتے تھے، صاف گوئی میں کسی مصلحت کے روادار نہ تھے، اپنے زمانہ کے تمام اکابر کا وہ بے حد احترام کرتے ان کی خدمت میں جاتے یہاں گنگوہ آنے کی دعوت دیتے، ان کے بیانات سے اہل مدرسہ اور قصبہ والوں کو استفادہ کے بار بار مواقع فراہم کرتے، اکابر بھی انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کی دعوت پر ضرور تشریف لاتے، اگر کوئی عذر ہوتا تو پیشگی یا بروقت مطلع بھی فرماتے، ذیل کے اس خط سے اندازہ کیجئے جو حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے آپ کو لکھا ہے۔

''محترم المقام زید مجدکم ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج مبارک ! مجھے سخت افسوس ہے کہ میں اس وقت حاضر نہ ہوسکا اعذار کی بنا پر اس قدر

تاخیر ہوئی کہ گاڑی چھوٹ گئی پھر ہم لاری کے اڈے پر گئے مگر وہاں پونے چار بجے پہنچے معلوم ہوا کہ پونے پانچ بجے تک انتظار کرنا ہوگا اس لئے میرا عذر اراکین مدرسہ سے ذکر کردیں اور معافی کی درخواست کردیں چوں کہ حضرت مولانا محمد (طیب) مہتمم صاحب اور دوسرے حضرات پہنچ گئے ہیں اس لئے میری غیر حاضری سے جلسہ میں کوئی نقصان نہیں ہوسکتا، تقدیر الٰہی پر تدبیر غالب نہیں آسکتی جملہ اراکین مدرسہ سے سلام عرض کردیں۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

۲۷رشوال ۱۳۷۲ھ

آپ کی قلبی دعوت پر مشائخ وقت اکثر تشریف لاتے رہتے تھے، جن میں دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، تبلیغی مرکز حضرت نظام الدین دہلی اور دیگر مقامات کے تمام بڑے اکابر بھی جامعہ میں قدم رنجہ ہوتے، مدرسہ چند طلبہ اور بعض مدرسین کی محدود تعداد سے شروع ہوا تھا لیکن تعلیم وتربیت کے قابل رشک انتظام نے ادارہ کو بہت جلد مرجعیت ومحبوبیت دیدی، اہل دل علماء اپنی اولاد واحفاد اور متعلقین کو تحصیل علم کے لئے یہاں بھیجتے بقول مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری مدظلہ مدیر ندائے شاہی کہ ''اشرف العلوم رشیدی دارالعلوم دیوبند کے لئے زینے کی حیثیت رکھتا تھا اور ہمارے بہت سارے بنگلا دیشی درسی رفقاء گنگوہ سے تیاری کر کے آئے تھے''۔

حضرت قاری صاحبؒ تعلیم کے باب میں آزمودہ کار شخصیت کے مالک تھے، انہیں افراد شناسی کا خوب ملکہ تھا، چنانچہ وہ اساتذہ کے تقرر میں اس ملکہ سے بھرپور فائدہ اٹھاتے اور ایسے اساتذہ کا تقرر کرتے جو باصلاحیت بھی ہوں اور بافیض بھی، طلبہ کو صلاح وصلاحیت سے ہم کنار کرنے کے لئے دارالعلوم ومظاہر علوم کے جیدالاستعداد اساتذہ وعلماء سے وقتاً فوقتاً مشورہ کرتے انہیں امتحان کیلئے اشرف العلوم آنے کی دعوت دیتے اور ارباب

اہتمام سے باقاعدہ اس کی اجازت لیتے، ذیل کے ایک خط سے آپ بھی اندازہ کیجئے!

''مکرم ومحترم زید مجدکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مرسلہ مکتوب موصول ہوا جواباً گذارش ہے کہ آپ کے مدرسہ کے امتحان کے لئے ۵ / ۶ رشعبان ۱۳۷۹ھ چہار شنبہ وپنجشنبہ مقرر ہوئی ہیں ان تاریخوں میں امتحان لینے کے لئے مولوی عبدالعزیز صاحب اور مفتی یحییٰ صاحب تشریف لائیں گے، رفقاء کار کی خدمت میں سلام مسنون۔

بندہ محمد اسعد اللہ غفرلہ

ناظم مظاہر علوم سہارنپور

چنانچہ ان اداروں کے مقتدر اساتذہ بغرض امتحان تشریف لاکر طلبہ کی تعلیمی وتربیتی صورت سے بزبان وقلم آگاہ فرماتے اور ترقیات کے لئے دعا گو رہتے، ایسے ہی ایک موقع پر دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ امتحان کے لئے تشریف لائے اور درج ذیل کا تأثرات کا اظہار فرمایا ''بسلسلۂ سفر احقر کو آج مدرسہ اشرف العلوم میں حاضری کا شرف حاصل ہوا اور مدرسہ کے چند بچوں کا کلام مجید نیز بعض بچوں کا علمی مکالمہ بھی سنا، مدرسہ کی حالت اور تعلیم وتربیت دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی، طرز تعلیم ماشاء اللہ نہایت عمدہ ہے، بچوں میں کافی صلاحیت پائی جاتی ہے'' یہ تفصیل کا موقع نہیں ہے ورنہ رجسٹر معائنہ میں بے شمار خطوط محفوظ ہیں جن میں اساتذہ دارالعلوم ومظاہر علوم نے یہاں کی تعلیم پر اطمنان کا اظہار کیا ہے اور حضرت قاری صاحبؒ کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

حضرت قاری صاحبؒ کا اساتذہ کے ساتھ معاملہ بھی بڑی شفقت کا تھا حالانکہ ادارہ میں پہلے ہی سے قلیل تنخواہوں کا معمول رہا جس کی وجہ اغلباً سرمایہ کی فراہمی اور تعمیرات کا بوجھ رہا ہوگا لیکن حضرت قاری صاحبؒ کا حسن سلوک انہیں اس کی اجازت نہ دیتا کہ وہ حضرتؒ سے تنخواہوں کے مسئلہ پر گفت وشنید کی ہمت بھی جتا سکیں، حضرت قاری

صاحبؒ کی ایسی معصوم ادائیں اور محبت کی داستان جب سننے کو ملتی ہیں تو آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں، راقم الحروف نے انہیں کبھی نہیں دیکھا جبکہ احقر کے دار العلوم میں دس سالہ قیام کے زمانہ میں شروع کے پانچ سال تک وہ بقید حیات رہے، ان کے بارے میں ہم طلبہ دار العلوم ذکر خیر کرلیا کرتے تھے، بعض مستفیدین اشرف العلوم بتلاتے کہ حضرت قاری صاحب طلبہ پر بے حد شفیق ہیں اور جو طلبہ ان سے قریب رہتے ہیں وہ ان سے والدین کی طرح محبت کرتے ہیں، یہی بات استاذ محترم حضرت مولانا ریاست علی بجنوری مدظلہ محدث دار العلوم دیوبند نے اپنے پیغام میں رقم فرمائی ہے۔

حضرت قاری صاحبؒ کی زندگی کے کسی پہلو کو گفتگو کا عنوان بنائیں، وہ ایک کامل مرد انسان تھے ان پر لکھے گئے معاصرین کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اخفائے حال کے دستور پر عمل پیرا تھے جو انہیں اپنے اسلاف سے موروثی طور پر ملا تھا، پہلے لوگ چھپنے کے بجائے چھپ کر خدمت کرتے تھے مگر سنت الٰہی کے مطابق بلندیاں انہیں کو سلام کرتی تھیں من تواضع للہ رفع اللہ کا عملی مشاہدہ ہمیں ان خاصان خدا کی بابرکت زندگیوں میں صاف نظر آتا ہے، بہرکیف بات طویل ہو رہی ہے وقت کا دامن بھی تنگ اور ان کی داستان طویل و عجیب بقول شاعر:

کبھی فرصت سے سن لینا عجب ہے داستاں ان کی

تقریباً ستر سال تک اشرف العلوم کی آبیاری کرنے والا دین وملت کا یہ مخلص خادم مشائخ کا منظور نظر ہزاروں نفوس کا روحانی باپ ماہر تعلیم سماجی خدمت گار اور مصلح امت ۴ر مئی ۲۰۰۵ء کو اپنے مالک حقیقی سے اس فرمان الٰہی کو سننے کے ساتھ جاملا یا ایتھا النفس المطمئنة ارجعی الیٰ ربک راضیة مرضیاً فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی، اس موقع پر خاکسار کو حضرت قاری صاحبؒ کے بالکل مناسب حال معروف

سیرت نگار مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے اپنے چھوٹے بھائی کی وفات پر کہے گئے اشعار یاد آرہے ہیں:

وہ وفا کیشیٔ احباب ،وہ مردانہ شعار
وہ دل آویزیٔ خو، وتگہ الفت یار
صحبت رنج بھی اک لطف سے کٹ جاتی تھی
اس کی ابرو پہ شکن آکے پلٹ جاتی تھی
حق نے کی تھی کرم ولطف سے اس کی تخمیر
خوبیٔ خُلق وتواضع میں نہ تھا اس کا نظیر
بات جو کہتا تھا ہوتی تھی وہ پتھر کی لکیر
اس کی اک ذات تھی مجموعۂ اوصاف کثیر
بس کہ خوش طبع تھا وہ صاحب تدبیر بھی تھا
سچ تو یہ ہے کہ وہ نوخیز بھی تھا پیر بھی تھا
اس کو شہرت طلبی سے کبھی کچھ کام نہ تھا
وہ کبھی مدعیٔ رہبریٔ عام نہ تھا
اس کو مطلوب کبھی گرمی بازار نہ تھی
اس کی جو بات تھی کردار تھی گفتار نہ تھی
اس کو معلوم جو تھا وسعت تعلیم کا راز
اس نے دیکھے تھے جو منزل کے نشیب اورفراز
اپنے یہ کام نئی طرح کیا تھا آغاز
مگر افسوس کہ تھا راہ میں رخش تگ وتاز

ملک وملت کے عظیم رہنما

فدائے ملت حضرت مولانا اسعد مدنیؒ

ملک وملت کے بے لوث خادم اوردین وسیاست کی اعلیٰ قدروں کے امین فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی علیہ الرحمہ کے سانحہ ارتحال کودو سال سے زائد کا عرصہ بیت رہا ہے مگران کی یادوں کے چراغ پہلے سے کہیں زیادہ روشن ہیں، ان یادوں کے سہارے ان کی تابناک زندگی کے بہت سے دریچے واہوتے ہیں مولانا مرحوم کی ذات ملک اورملت دونوں کیلئے شجر سایہ دار کی سی تھی خصوصاً اس لئے بھی کہ گذشتہ نصف صدی کے اواخر میں ان کے ہم پلہ کوئی دوسرا ملی وسیاسی مسلم قائد نظر نہیں آتا، اس ناگفتہ بہ دور میں ان کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ محسوس کی جارہی ہے، ان کا وجود مسلمانوں اور برادران وطن کیلئے بھی مشعل راہ تھا ملک اورقوم کے پیش آمدہ مسائل کا ادراک وہ قبل ازوقت کرلیتے تھے، اوراس کے مناسب حل اور تدارک کیلئے فوراً کمربستہ ہوجاتے، اس حقیقت کا اعتراف گذشتہ سال دہلی کے تاریخی اور پرشکوہ ہال وگیان بھون میں ۲۳، ۲۴ر اپریل کومنعقد ہوئے فدائے ملت سیمینار میں وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ ان کے سینئر کابینی رفقاء پرنب مکھرجی شیوراج پاٹل پریہ رنجن داس منشی اور پروفیسر سیف الدین سوز وغیرہم نے بھی کیا، دراصل مولانا مدنی ہندوپاک بنگلادیش کے زمینی حقائق اور جغرافیائی احوال سے اچھی طرح واقف تھے، وہ بیرونی مداخلت کوان ممالک کیلئے سنگین خطرہ تصور کرتے تھے، بنابریں وہ پڑوسی ممالک سے خوشگوار تعلقات کیلئے عملاً کوشاں رہتے اور پیش قدمی فرماتے، چنانچہ اس جذبے سے سرشار ہوکر انہوں نے باہمی

اتحاد کا فلسفہ پیش کیا اور بی جے پی کے دور حکومت میں بھی جبکہ دونوں ملکوں کے سیاسی اور خارجی اختلافات گہرے ہو گئے تھے اور سفارتی نقل وحرکت ختم ہو چکی تھی مولانا مدنی بے چین ہو گئے اور میدان عمل میں کود پڑے، انہوں نے تیسری طاقت کے ارادوں کو تاڑ لیا، چنانچہ سفارتی رشتوں کو استوار کرنے اور اختلافات دور کرنے کی خاطر ملک کی اعلیٰ قیادت کو خبردار کیا، ادھر پاکستان کے اس وقت کے اپوزیشن لیڈر مولانا فضل الرحمن کو ہندوستان آنے کی دعوت دی ان کے ہندوستان دورے کے بعد ہی دونوں ملکوں کے مابین خوشگوار تعلقات کا آغاز ہوا۔

مولانا مدنی نے اس خیال کو مزید تقویت بخشی کہ آپسی اختلافات کا واحد حل صرف اور صرف مذاکرات کی میز ہے اور یہ کہ ہم ہر اختلاف اور خلفشار کو گفتگو اور سنجیدہ کوششوں سے دور کر سکتے ہیں، انہوں نے اپنے والد مرحوم حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے اصولوں کو پروان چڑھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا وہ دو قومی نظریہ کو ملک وقوم کے وسیع تر مفاد کا قاتل گردانتے تھے، مولانا اسعد مدنی سیکولر روایات پر یقین رکھتے تھے ان کی مکمل زندگی اس تھیوری کے اردگرد گھومتی ہے، ان کا ایک بھی قدم اس اصول سے متجاوز نہ ہوا، حالانکہ اس دائرہ میں رہ کر انہوں نے ملت کیلئے بے شمار اقدامی کوششیں کی جمہوری نظام پر انہیں اطمینان تھا اور اس کی روشنی میں وہ قومی اور ملکی مسائل کا حل تلاش کرتے تھے، جمعیۃ العلماء ہند کے پلیٹ فارم سے انہوں نے اپنی فکر وبصیرت کے جلوے بکھیرے اور اس باوقار تنظیم کو عروج واستحکام بخشا، اس کے مرکزی دفتر کو گلی قاسم جان سے مسجد عبدالنبی لے گئے جو دارالسلطنت کا وی آئی پی علاقہ ہے، مولانا مرحوم مضبوط اعصاب وقویٰ کے مالک تھے راحت وآرام سے گویا انہیں دشمنی سی رہی، ہر لمحہ تازہ دم رہے اور ملت کیلئے کچھ کر گذرنے کا جذبہ جنون کی حد تک ان پر سوار رہا ع

چلا جا تا ہوں ہنسا کھیلتا موجِ حوادث میں
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہوجائے

سخت اور ناموافق حالات سے ٹکرانے میں انہیں مزہ آتا تھا، اسی لئے وہ ہر نازک مرحلہ پر نہایت کامیابی سے آگے بڑھ جاتے، شجاعت و بسالت میں وہ فخر روزگار تھے ہمت وعزیمت اور جرأت واستقامت سے ان کا خمیر اٹھا تھا ان کے عناصر ترکیبی میں ان جیسے اوصاف کی فراوانی تھی جس کا مشاہدہ جا بجا ہوتا تھا، اندرون ملک جب کبھی فرقہ پرستی کا ناچ ہوتا مولانا مدنی شیر کی طرح دہاڑتے ہوئے فرقہ پرستوں پر ٹوٹ پڑتے، فتح وظفر اور اقبال مندی ان کا استقبال کرتی اور ایک آن میں انہیں اپنے دامن میں سمیٹ لیتی، مولانا اسعد مدنی عظیم باپ کے لائق ترین فرزند تھے وہ دین وسیاست کے پرکیف اور حسین امتزاج تھے، دین وسیاست کی تفریق کے وہ روادار نہ تھے، بلکہ عملاً انہوں نے ثابت کردکھایا کہ ان پرآشوب حالات میں بھی دین اور سیاست کی اعلیٰ قدروں کو ایک ہی اسٹیج سے کس طرح پروان چڑھایا جا سکتا ہے؟۔

تین میقاتوں میں وہ ایوانِ بالا کے رکن رکین رہے اور کم وبیش ۱۸ ر سال تک پارلیمنٹ کے اندر اپنی سیاسی فکر وبصیرت کی روشنی بکھیرتے رہے، مولانا کی سیاسی وابستگی اگرچہ کانگریس سے ہی رہی لیکن سماجی وملی وحدت کی خاطر تمام سیکولر لیڈروں سے ان کا گہرا ربط تھا، جمیۃ العلماء ہند کے اسٹیج پر وہ ہر انصاف پسند اور سیکولر شخص کو لانے کی کوشش کرتے اس میں انہیں مکمل کامیابی ملتی متعدد بار جیل بھی گئے اور ملک وملت بچاؤ تحریک چلائی، وندے ماترم اور یکساں سول کوڈ کی بھرپور مخالفت کی، مذہبی بل جو کہ بی جے پی کی سابقہ حکومت کے وزیر اعلیٰ رام پرکاش گپتا کی کارستانی تھی اسے ٹھنڈے بستہ میں ڈلوانے پر مجبور کیا، مسلم پرسنل لاء کے تحفظ اور شاہ بانو کیس میں کلیدی رول ادا کیا، آسامی

مسلمانوں پر جب وہاں کی حکومت نے عرصۂ حیات تنگ کردیا اورانہیں غیر ملکی قرار دے کر جلاوطن کرنے کی ناپاک کوشش کی تو انہوں نے حکومت کو الٹی میٹم دیا کہ وہ بلا تاخیر آسامیوں پر زیادتی کا دروازہ بند کرے بصورتِ دیگر سنگین نتائج کیلئے تیار رہے،مگراس کے باوجود کانگریس حکومت نے توجہ نہیں دی نتیجتاً مولانا مدنی سیاسی وابستگی کے باوجود کانگریس کے خلاف میدان میں آگئے اور اپنے خلیفہ حضرت مولانا بدرالدین اجمل القاسمی کو ایک سیاسی پارٹی تشکیل دینے پر آمادہ کیا تاکہ دستور کی روشنی میں اپنے حقوق کی لڑائی لڑی جائے اور حکومت مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کا دروازہ بند کرے، فدائے ملت کی اس دوررس کوشش کا مفید اثر دیکھنے میں آیا اور حکومت کے کان کھڑے ہوگئے ،فدائے ملت کی زندگی نے وفا نہیں کی ورنہ وہ کچھ اور بصیرت افروز سامان تیار کرجاتے، واقعی وہ جامع الجہات شخصیت کے پیکر تھے، آخران کی کن کن خدمات کو اجاگر کریں ان کی تمام تر زندگی قومی، ملی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی جدوجہد سے عبارت ہے، ہندوستان میں وہ مدرسہ تحریک کے سرخیل تھے ملک کے چپہ چپہ پر انہوں نے مدارس کا جال پھیلایا، دارالعلوم دیوبند کی بنیادوں کو استحکام بخشا، ارباب مدارس کو بھی ان سے روشنی ملتی تھی اوران کے گراں قدر مشورے راہِ عمل متعین کرنے میں ممدومعاون ثابت ہوتے، آج جبکہ دہشت گردی اور دیگر عنوانوں سے مدارس اسلامیہ کے وابستگان کو ہراساں کیا جارہاہے اوران کے روشن کارناموں کو حرف غلط کی طرح مٹانے کی سازشیں ہورہی ہیں، مسلم نوجوانوں کی گرفتاریاں عمل میں آرہی ہیں مولانا اسعد مدنی مرحوم کا خلاء شدت سے محسوس کیا جارہاہے، کاش وہ اس دنیا میں ہوتے توان کی ضوفشانی اس تاریکی میں مشعل راہ بنتی، مولانا مرحوم کے رخت سفر سے یہاں کی شادابی بھی رخصت پذیر ہے وہ ہر بزم میں چراغ بزم تھے چمن میں ان کی موجودگی فضا کو معطر رکھتی تھی ع

صحنِ چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا　　وہ آگئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے

فی الحقیقت مولانا مدنی متضاد خوبیوں سے آراستہ تھے وہ دینی مصلح بھی تھے اور سیاسی قائد بھی، دین واشاعت، وعظ وارشاد، اصلاح وتزکیہ غرضیکہ ہر شعبہ میں انہوں نے اپنی منفرد شخصیت اور خوبصورت سیرت کے نقوش چھوڑے، مولانا مدنی اپریل ۱۹۲۸ء کو دنیا کے قافلہ میں شامل ہوئے اور ۶ر فروری ۲۰۰۶ء کو اللہ کے جوار میں چلے گئے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

(بہ شکریہ ماہنامہ ریاض الجنۃ جون پور، جون ۲۰۰۸ء)

ممتاز صحافی

جناب بابو نسیم مسعود عثمانی دیوبندیؒ

گہوارۂ علم وادب اور سرسبز وشاداب خطہ دیوبند کے ممتاز صحافی ونامہ نگار جناب مسعود عثمانی صاحب بھی بالآخر اپنی زندگی کے تقریباً ۶۳ رسال گذار کر دار آخرت کو سدھار گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، مرحوم کئی ماہ سے صاحب فراش تھے علاج معالجے کے بہت سے مراحل طے کئے مگر موت سے رستگاری نہیں۔ چنانچہ ۷ ر جولائی بروز جمعہ کو انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اس طرح سے دیوبند اپنے ایک قابل قدر انسان سے محروم ہوگیا۔

مسعود عثمانی صاحب اس خاندان کے چشم و چراغ تھے جس کا شمار از ہر ایشیاء اور احیاء اسلام کی عظیم تحریک ''دارالعلوم دیوبند'' کے بانیین میں ہوتا ہے، یہ خاندان اپنی نسبی شرافت اور وجاہت وعظمت کے اعتبار سے دیوبند کا ایک تابندہ عنوان رہا ہے۔

عثمانی صاحب مرحوم ۲۸ ر فروری ۱۹۴۳ء کو پیدا ہوئے چوں کہ پورا خانوادہ علم وادب سے آراستہ تھا اس لئے انہوں نے بھی اپنے کو تعلیم کی ڈگر پر ڈال دیا اور ضروری تعلیم سے فراغت حاصل کر کے اپنی علمی زندگی کا آغاز صحافت وادب سے کیا، میدان صحافت وادب کو انہوں نے اپنی جولان گاہ فکر بنایا اور آغاز شباب ہی سے وہ اس میدان میں طبع آزمائی کرنے لگے، ملک کے مختلف اخبارات ورسائل میں وہ اپنے مضامین بھیجتے جو نہایت اہتمام سے شائع ہوا کرتے وہ ایک نمایاں صحافی اور نامہ نگار تھے، ان سے واقفیت تو بہت بعد میں ہوئی مگر ان کا طویل القامت جثہ اور چہرے کے خدوخال اس وقت ذہن کے نہاخانوں میں مرتسم ہوچکے تھے جب وہ دارالعلوم کے مدنی گیٹ سے اکثر

دارالعلوم کے اساتذہ سے تبادلہ خیال کرنے کے لئے جاتے، پھر جب دیوبند کی صاحب قلم شخصیت حضرت مولانا ندیم الواجدی صاحب نے یہاں سے اپنا وقیع اور کثیر الاشاعت ماہنامہ ''ترجمان دیوبند'' شروع کیا تو ماہنامہ کے مرکزی دفتر کی جانب ان کو بارہا قدم بڑھاتے ہوئے دیکھا ان کو متعدد بار علمی سماجی اور سیاسی نشستوں میں دیکھنے کا اتفاق ہوا، مگر اس خیال سے شناسائی کی ہمت نہیں کی کہ معلوم نہیں کس قسم کے انسان ہیں اور ان کی ملاقات کے کیا طور طریقے ہیں؟ ویسے بھی ہر انسان اپنے مزاج وخیال کے لحاظ سے اپنی الگ شناخت رکھتا ہے اور یہ تخلیق انسانی کا ایک فطری اور طبعی تقاضہ ہے۔

محترم عثمانی مرحوم کی شخصیت سے مکمل آگہی اس وقت ہوئی جب محترم مولانا مسعود ندوی نے ایک دینی اور علمی مجلہ نکالنے کا عزم ظاہر کیا، رسالہ ''نقوش اسلام'' کے رجسٹریشن کا مسئلہ سامنے آیا تو مولانا ندیم الواجدی نے اس کے لئے محترم عثمانی کی شخصیت کو نہایت موزوں قرار دیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سلسلہ میں جو اہم پیش رفت ہوسکی وہ انہیں کی رہین منت تھی، یہیں سے عثمانی مرحوم کی شخصیت اور ان کے صحافتی مقام سے واقفیت ہوئی۔ بظاہر وہ کم گو معلوم ہوتے تھے، لیکن جب ان سے کسی مسئلہ پر گفتگو ہوتی تو پھر وہ خوش گفتاری سے ہر سلگتے اور حساس موضوع کا تحلیل وتجزیہ کرتے وہ ماضی سے باخبر، حال سے واقف، مستقبل کا دیدہ ور اور اسلامی جذبے سے سرشار صاحب بصیرت انسان تھے، وہ ہر بزم میں چراغ بزم رہے۔

دارالعلوم اور اس کے باہر جب کبھی وہ ملتے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے، اپنے چھوٹوں پر بہت مہربان تھے بارہا ان کے مسکن پر جانے کا اتفاق ہوا وہ ایک نفیس الطبع مہمان نواز اور بااخلاق انسان تھے، بسا اوقات ''ترجمان دیوبند'' کے ایڈیٹوریل پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے کہ مولوی صاحب! رسائل واخبارات سے دنیا پٹی

پڑی ہے مگر تحقیقی اور علمی چیزوں کا فقدان ہے اس کے باوجود "ترجمان دیوبند" جیسے علمی اور تعمیری مجلوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ،ضرورت ہے کہ ایسے رسالے خرید کر پڑھے جائیں ان کا علمی حلقہ وسیع ہوتا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کرسکیں۔

وہ خود بھی امتیازی حیثیت کے صحافی اور نامہ نگار تھے جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا کہ انہوں نے اپنی علمی زندگی کو صحافت کا پیرہن بخشا اور سماج کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیا اور اخیر تک اس سے وابستہ رہے ان کے اہل خانہ کے مطابق عثمانی مرحوم کو ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کے باعث اسی کی دہائی میں قومی آواز اور ہندی دینک ہندوستان جیسے موقر روزناموں میں ان کو اپنا نامہ نگار بنایا،قومی آواز اس زمانے میں اپنے شباب پر تھا موصوف نے اپنی ذمے داری کو بخوبی ادا کیا، اجلاس صد سالہ کے موقع پر اپنا آرگن "نگر اسپارٹ" بڑی آب وتاب سے نکالا اور شیدائیان صحافت کو سیراب کرتے رہے۔مگر گوناگوں مسائل اور اقتصادی کمزوریوں نے اس پندرہ روزہ "اخبار" کو زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہنے دیا البتہ قومی آواز کے وساطت سے وہ اپنا مشن چلاتے رہے، وہ تعمیری صحافت کے قائل تھے،یہی وجہ تھی کہ وہ واقعات اور خبروں کی ترسیل میں غیر جانبداری اور معروضیت کے قائل تھے، ان کا خیال تھا کہ خبر نویسی میں سنسنی خیزی بالکل روا نہ رکھی جائے ،علاوہ ازیں خبر کو رائے کی آمیزش سے داغ دار نہ کیا جائے ورنہ پھر اخبار کا وقار ختم ہوجاتا ہے اور یہ رائے کا آمیزہ بن کر رہ جاتا ہے جو آداب صحافت کے منافی ہے۔

موصوف عجلت پسندی سے ہمیشہ دور رہتے متانت اور سنجیدگی سے واقع کی تہہ میں پہنچنے کی کوشش کرتے ،ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ ہماری ذمے داری یہ ہونی چاہئے کہ ہم اپنی عظمت ورفعت کو یاد کریں اور قوم کو بیدار کرکے ان میں حمیت وغیرت کا صور پھونکیں اور یہ ہی ہماری صحافت کا نصب العین ہونا چاہئے ،موصوف خود بے کم

وکاست خبروں کی ترسیل کو اپنا فریضہ بتاتے تھے، اور یہی ان کی صحافتی زندگی کا طرۂ امتیاز تھا، ان کے انتقال پر دیوبند و بیرون دیوبند کی سرکردہ علمی ادبی اور سماجی شخصیات نے اپنے شدید رنج وغم کا اظہار کیا ہے، مشہور صحافی و عالم دین مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مسعود عثمانی نہایت وسیع القلب روشن دماغ اور بڑے خلیق تھے میں نے ان کی نگارشات قومی آواز میں پابندی سے پڑھیں نہایت جنچے تلے انداز میں وہ اپنی بات لکھتے اور کہتے تھے وہ دبستان دیوبند کے دیرینہ رفیق بنے رہے فریق کبھی نہیں بنے وہ زمانہ شناس اور وقت کے نباض تھے، یقیناً ان کا وصال ایک ناقابل تلافی نقصان ہے، مرحوم کی نماز جنازہ دارالعلوم دیوبند کے سینئر استاذ حضرت مولانا بلال اصغر نے ان کے سینکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں احاطہ مولسری میں ادا کرائی، مرحوم اپنی اہلیہ محترمہ کے جدامجد حضرت حاجی عابد حسین صاحب کے پہلو میں آسودۂ خاک ہوئے ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

مرحوم کے پسماندگان میں ان کی شریک حیات تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہیں، بڑے صاحبزادے ماسٹر زعیم عابد معروف تعلیمی ادارہ جامعۃ الامام محمد انور شاہ میں انگریزی زبان وادب کے استاذ ہیں جب کہ دوسرے صاحبزادے ذکی انجم امریکن ای فنڈ انٹرنیشنل کال سینٹر گڑگانواں میں ملازم ہیں، تیسرے صاحبزادے رفیع عثمانی بسلسلہ ملازمت دیوبند میں ہی مقیم ہیں۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (یہ مضمون ماہنامہ ''ترجمان دیوبند'' بابتہ ماہ اگست، ستمبر ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا)

مفتی کفیل الرحمن نشاط عثمانی: نقوش وتأثرات

ابھی ندوۃ العلماء کے مایۂ ناز عالم دین حضرت مولانا محمد عارف صاحب سنبھلیؒ کے حادثہ فاجعہ کی اندوہناک خبر دل ودماغ سے محو بھی نہیں ہوئی تھی کہ یکم اگست ۲۰۰۶ء بروز منگل بوقت ساڑھے دس بجے صبح دار العلوم دیوبند کے مائک سے یہ ناگہانی اطلاع دی گئی کہ دار العلوم دیوبند کے نائب مفتی حضرت مولانا کفیل الرحمن نشاط عثمانی کا انتقال ہوگیا ہے، اس اچانک حادثہ نے فوراً دل ودماغ کو پاش پاش سا کردیا ہر شخص کی زبان پر بے ساختہ انا للہ وانا الیہ راجعون کے کلمات جاری ہوگئے، مادر علمی کی پوری فضا سوگوار ہوگئی، سالانہ امتحان کی گہما گہمی کے باوجود ذمے داران، اساتذہ اور طلباء کا مفتی صاحب مرحوم کے مکان پر تانتا بندھ گیا، ہر کوئی مفتی صاحب کے نورانی چہرے کو اشک بار آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، ایسا لگتا تھا کہ آخرت کا یہ مسافر مزے کی نیند سو رہا ہے اور دنیا کے مختلف جھمیلوں سے دور، چین وسکون کی آغوش نے انہیں سمولیا ہے۔

مولانا کفیل الرحمن کی بھاری بھرکم علمی وعملی شخصیت کے نقوش وخطوط نہایت تابناک اور قابل رشک تھے، وہ مثالی زندگی گذار کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوگئے، کہتے ہیں کہ دنیا سے رخت سفر باندھنے والے کو اس کی خوبیوں کے ساتھ یاد کرنا چاہئے اور یہی پیغام ہمیں حضور اکرم ﷺ کے پاک ارشاد ”اذکروا محاسن موتکم“ (الحدیث) سے ملتا ہے، مگر مولانا مرحوم کے یہاں سوائے خوبیوں کے اور تھا ہی کیا، یہ مولانا کی محبوبیت اور عند اللہ مقبولیت کا ہی اثر تھا کہ ان کی نماز جنازہ میں ہزاروں فرزندان توحید نے شرکت کی، جس میں معلوم نہیں کیسے کیسے علماء، صلحاء، اتقیاء اور قابل قدر انسان ہوں گے، مولانا کی رحلت پر تمام چہرے مغموم تھے، بقول شاعر ع

موت اس کی ہے کرے جس پہ زمانہ افسوس
یوں تو سب آئے ہیں اس دنیا میں مرنے کے لئے

ولادت

مولانا کفیل الرحمن نشاط دیو بند کے معروف علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، وہ ۱۹۳۹ء میں جناب قاری جلیل الرحمن عثمانی کے گھر پیدا ہوئے۔

مولانا کے جد امجد حضرت مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ صاحب مرتب ''فتاویٰ دارالعلوم دیو بند'' اپنی فقہی بصیرت اور منفرد اسلوب تحریر ونگارش کی بنا پر دنیا بھر میں مشہور تھے، وہ دارالعلوم کے مفتی اول تھے، مفتی عزیز الرحمن عثمانی، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا حبیب الرحمن عثمانی وغیرہ دارالعلوم کے بانیین میں سے ایک ہیں، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو ان پر مکمل اعتماد تھا، غرض یہ کہ پورا خاندان زیور علم وعمل سے آراستہ رہا ہے، مولانا کفیل الرحمن نشاط بھی اس سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی تھے، وہ کردار کے غازی اور اسلاف کے نمونہ تھے، ان کی طبعت میں ہمہ گیری، خودداری، خوداعتمادی، صاف گوئی، بے باکی اور حق شناسی نمایاں نظر آتی تھی، یہ سب کچھ انہیں اپنے خاندان سے وراثت میں عطا ہوا تھا۔

تعلیم اور فراغت

مولانا کفیل الرحمن نشاطؔ بہت تھوڑی عمر میں حفظ قرآن کریم کی دولت سے مالا مال ہوگئے اور بنیادی تعلیم کے مراحل طے کر کے وہ ازہر الہند دارالعلوم دیو بند میں داخل ہوئے، قوت حافظہ میں بے نظیر تھے، یہاں انہوں نے اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کے چراغ

روشن کئے، دارالعلوم کے موقر اساتذہ کی انہیں قربت حاصل رہی اور وہ حصول علم کے لئے مسلسل کوشاں رہے، ۱۳۷۹ھ میں انہوں نے دورۂ حدیث شریف (فضیلت) کی تکمیل کی، ان کا تعلیمی سفر رواں دواں رہا اور ۱۳۸۱ھ میں وہ شعبۂ افتاء سے فارغ ہوئے، فقہ وفتاویٰ میں انہیں خصوصی سند اجازت مفتی مہدی حسن شاہ جہاں پوری سے حاصل تھی، موصوف نے صرف مذہبی علوم پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے مطالعہ کو وسعت دینے کے لئے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے عربی میں ایم، اے (M.A) کیا، ان کی تعلیمی سرگرمیاں ان کے آخری دم تک جاری رہیں (العلم من المهد الی اللحد)۔

تدریسی سفر

مفتی صاحب کی غیر معمولی علمی استعداد کے پیش نظر دیے داران دارالعلوم نے ان کا تقرر ۱۳۹۶ھ میں شعبۂ افتاء میں برائے فتویٰ نویسی کیا اسی دوران افتاء کے طلباء کو انہوں نے ''رسم المفتی'' (تمرین فتویٰ کی مشہور کتاب) کا درس بھی دیا، مگر تدریس کا سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا اور وہ فتویٰ نویسی کے لئے یکسو ہو گئے، موصوف کا طرز نگارش اور اسلوب تحریر ان کے جدامجد حضرت مفتی عزیز الرحمن عثمانی کے مشابہ تھا، وہ فتویٰ نویسی میں بہت محتاط تھے، ان کا اختصار قابل فہم ہوتا تھا، جواب ایسا تحریر فرماتے جو سوال کے تمام گوشوں کو حاوی ہوتا، کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ مولانا مفتی عبدالعزیز رائے پوری سے کسی مسئلہ کے متعلق مولانا کفیل الرحمن کا زوردار مباحثہ ہوا اور انہوں نے مسئلہ کو عقلی اور نقلی انداز میں نہایت خوش اسلوبی سے ثابت کیا، جس سے مفتی عبدالعزیز رائے پوریؒ بہت متاثر ہوئے اور برجستہ کہا کہ مفتی کفیل الرحمن سلجھے ہوئے ہیں، مولانا کفیل الرحمن نے بڑی جانفشانی سے دارالافتاء کے تقاضوں کو پورا کیا، دارالافتاء کے

ایک رفیق مفتی خورشید حسن قاسمی کے مطابق انہوں نے دارالافتاء میں تقریباً ۴۲ رسال گذارے اس مدت میں انہوں نے پچاس ہزار کے قریب فتاویٰ تحریر فرمائے، فتاوی کی یہ مجموعی تعداد مفتی کفیل الرحمن کی محنت، لگن، جہد مسلسل اور دارالافتاء میں ان کی مسلسل موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ اوقات مدرسہ کے بہت پابند تھے، تقویٰ وطہارت میں بے مثل تھے، مدرسہ کے وقت میں کسی ذاتی کام کا تصور بھی نہیں تھا حتی کہ اپنے کام میں دارالافتاء کی قلم وسیاہی تک استعمال نہیں کی۔

مولانا مرحوم ایک زندہ دل متحرک، روشن ضمیر چشم کشا، حقیقت شناس اور آفاق بیں عالم کی طرح اپنے گردوپیش سے پوری طرح باخبر رہتے تھے، ان کا تمسک بالقرآن والسنۃ دیدنی تھا، خوبصورت، روشن جبیں، متوازن جسم، برقی مگر سنجیدہ رفتار، بغل میں کتابیں اور بیگ لئے یہ فرشتہ صفت انسان دارالافتاء، دارالعلوم، مسجد عزیز یا پھر اپنے مکان کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آتا تھا، تواضع اور انکساری خاص وصف تھا، ملنسار، مہمان نواز اور نہایت خلیق تھے، غیر ضروری امور سے دلچسپی بالکل نہیں تھی۔

تصنیفی وتالیفی سرگرمیاں

مولانا مرحوم کا میدان اگر چہ خالص فقہی غواصی کا تھا، مگر اس کے باوجود متعدد اصناف سے دلچسپی رکھتے تھے، وہ جہاں ایک طرف عالم باعمل تھے وہیں ایک کامیاب مدرس بہترین شاعر اور اعلیٰ درجے کے تخلیق کار تھے، وہ ہر میدان کے شناور اور ماہر تھے، وہ بہت سی عربی، اردو اور فارسی کتب کے مصنف اور شارح تھے، فتاویٰ عالمگیری کا اردو ترجمہ ہو، یا نحو کی مثالی کتاب ''شرح جامی'' کی تشریح وتحلیل، ہر جگہ انہوں نے طبع آزمائی کی، ان کی تحریر وانشاء شائستہ وشگفتہ ہوتی تھی، اخبارات ورسائل اور دیگر پیغام رساں

اداروں میں وہ اپنے جلوے بکھیرتے نظر آتے تھے، نظم ونثر دونوں پر یکساں عبور حاصل تھا، بلکہ نظم میں تو وہ دبستان دیوبند میں اپنی انفرادی شناخت کے مالک تھے، ان کی بے شمار نعتیں، نظمیں اور غزلیں ان کی اچھوتی شاعری کا پتہ دیتی ہیں۔

لاتعداد سہرے، رخصتیاں، اور اشعار انہوں نے لکھے جو ان کے یہاں گیا کبھی مایوس نہیں لوٹا، خودداری اس حد تک کہ کبھی کسی سے معاوضہ طلب نہیں کیا، وہ استاذ شاعر کا درجہ رکھتے تھے، ان امتیازات وکمالات سے متصف ہونے کے باوجود نام ونمود سے کوسوں دور رہے، چنانچہ انہوں نے اپنے شائع شدہ اور غیر مطبوعہ کلام کو یکجا کرنے کے بارے میں سوچا تک نہیں۔

کسی طرح دیوبند کے کہنہ مشق صحافی جناب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے ان کو ان کے آخری ایام میں رضامند کر ہی لیا، کہ وہ اپنا مجموعہ کلام منظر عام پر لائیں، مفتی صاحب مرحوم نے اس کی اجازت دیدی اور ان کے کلام کا ایک بڑا ذخیرہ ''شناسا'' کے نام سے شائقین علم وادب کے ہاتھوں چند ماہ قبل آ پہنچا، مولانا مرحوم اس مجموعہ کلام کے بارے میں خود رقم طراز ہیں ''تقریباً چالیس سالہ ادبی سفر کا مختصر انتخاب پیش ہے، اس طویل ادبی سفر میں سبزہ زاروں کی بھی سیر کی، پھولوں کی دلآویز نکہتوں نے بھی مشام دل وجاں کو معطر کیا، راہ کے کانٹے بھی والہانہ استقبال کے لئے آئے، صحرا کے پر ہول سناٹے بھی دیکھے، گاؤں کی پگڈنڈیاں، شہر کے صاف شفاف راستے، قصباتی زندگی کے مناظر، تجربات کی نگاہ سے گذرے''......۔

مولانا کے اس مجموعہ کلام کے مطالعہ سے ان کے صالح افکار کا پتہ چلتا ہے، ان کی شاعری انسانیت کے درد کا درماں ہے، ادیب شہیر مولانا نسیم اختر شاہ قیصرؔ ان کی شاعری پر کچھ یوں تبصرہ فرماتے ہیں، ''ان کے اشعار میں شدت احساس، علوئے فکر،

خیال آفرینی اور قوت اظہار کے ساتھ ساتھ صحن میکدہ کا شعور، شیشۂ مَی کی نزاکت اور باد صبح کا پیغام موجود ہے، حقیقت یہ ہے کہ نشاط صاحب نے مسلسل تجربے اور گہرے مشاہدے پر اپنی شاعری کا قصر زریں تعمیر کیا ہے"۔

مولانا کفیل الرحمن عشق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہمیشہ ڈوبے نظر آتے ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کبھی لب پہ ذکر حرم رہے کبھی لب پہ ذکر نبی رہے
میری زندگی میں بفضل رب یونہی شمع نور جلی رہے
میری آرزو کے چراغ کو جو ملے قبول کی روشنی
نہ خیال صبح سکوں رہے، نہ ملال تیرہ شبی رہے

مرحوم کی شاعری ان کی بیدارئ فکر کی ایک کامیاب کوشش ہے، جو انہوں نے نہایت چابکدستی سے سماجی زندگی میں انقلاب لانے لئے بطور ہتھیار استعمال کی ہے۔

انہوں نے اسے سامان تفریح کے بجائے صالح اقدار کو عظمت ورفعت دینے کے لئے استعمال کیا، مولانا کی شاعری یقیناً راہ حق کے متلاشی کے لئے زاد راہ اور مشعل راہ بنی رہے گی۔

راقم السطور کو ان سے بے حد لگاؤ تھا، وہ اسلاف کے نادر واقعات سناتے رہتے تھے، بالخصوص علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی طلاقت لسانی مولانا ابوالکلام آزاد کی سحر انگیز خطابت اور رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ کے طرز استدلال کے وہ بہت مداح تھے، انہوں نے ہمیشہ محبتوں سے نوازا، وہ ہر فرمائش کی تکمیل کرنے کی کوشش کرتے، چنانچہ مرکز احیاء الفکر الاسلامی کے رئیس مولانا محمد مسعود عزیزی ندوی کے اصرار پر احقر نے ان سے "نقوش اسلام" کے افتتاحی شمارہ (مارچ ۲۰۰۶ء) کے لئے منظوم کلام کی درخواست کی

اورانہوں نے مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی یاد میں شائع ہونے والے اس مجلہ کے لئے اپنا خوبصورت کلام جو کہ رسالہ کی فکر اور عزائم کی تضمین سے عبارت تھا عنایت فرمایا، اس کے بعد وہ ازخود مودت ومحبت کی بنیاد پر ''نقوش اسلام'' کے لئے برابر لکھتے رہے، وہ ہر ماہ نئے شمارہ کے انتظار میں رہتے، کم از کم حضرت مفتی صاحب کے بارے میں یقین کامل تھا کہ وہ اس مجلہ کو از اول تا آخر ملاحظہ فرماتے تھے۔

مرحوم کی نماز جنازہ ان کے برادر اکبر مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی مفتی اعظم پنجاب نے احاطۂ مولسری میں ہزاروں سوگوار کی موجودگی میں پڑھائی اور تدفین مزار قاسمی میں عمل میں آئی۔

اللہ تعالیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی کرے

ع

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مرجاؤں گا

میں تو دریاں ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

(بہ شکریہ ماہنامہ نقوش اسلام بابتہ ماہ ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۶ء)

مولانا عبدالکریم پاریکھ فرشتہ صفت انسان تھے

۱۱رستمبر ۲۰۰۷ء کو ایک ستارہ اور ٹوٹا یعنی مشہور داعی و مبلغ اور ملک وملت کے مایۂ ناز فرزند وجاں نثار مولانا عبدالکریم پاریکھ اس دنیا سے رخصت ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا عبدالکریم پاریکھ ان چنیدہ شخصیات میں سے ایک تھے جن کو اللہ رب العزت نے غیر معمولی ذکاوت وفطانت، اصابت فکر اور اعتدال وتوازن کا وافر حصہ عطا کیا تھا، انہوں نے اپنی محنت اور کوششوں سے مسلمانوں کی بہر نوع خدمات انجام دیں، وہ ہندو مسلم اتحاد کے بھی نقیب تھے، گنگ وجمن تہذیب کی مشترک قدروں پر انہوں نے کبھی آنچ نہیں آنے دی، بلکہ اس کے احیاء میں ان کا نمایاں کردار رہا، دراصل یہ کوئی نیا فلسفہ نہیں تھا بلکہ یہ ہمیں اپنے بزرگوں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ سے وراثت میں ملا تھا، مولانا پاریکھ مرحوم نے اس فلسفہ پر عمل کیا اور وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے عملاً کوشاں رہے، بلا شبہ ان کا انتقال یہاں کے مسلمانوں کیلیۓ ناقابلِ تلافی نقصان ہے، اللہ تعالیٰ ان کا نعم البدل عطا کرے، آمین۔

مولانا عبدالکریم پاریکھ ۱۵راپریل ۱۹۲۸ء کو مہاراشٹر کے آکولہ شہر میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیمی مراحل طے کرکے وہ کسی کولڈ ڈرینک ہوٹل میں ملازمت سے وابستہ ہوگئے، مگر چوں کہ محنت وجستجو اور جذبہ عمل سے ان کا خمیر تیار ہوا تھا، اس لئے انہوں نے بذاتِ خود لکڑیوں کی خرید وفروخت کی تجارت شروع کردی، اس میدان میں وہ لگے رہے اور بہت جلد انہوں نے ترقی کی شاہراہ کو پالیا اور ایک کامیاب واصول پسند تاجر کی شکل

میں سامنے آئے، مگر انہوں نے اپنے تہذیبی اور ملی شناخت نامے اور کردار کو محفوظ رکھا، یقیناً یہ ان لوگوں کے لئے بھی نمونہ عمل ہے جو تھوڑی سی دنیوی ترقی اور شہرت پاکر اپنے دین و مذہب سے رشتہ کو کمزور کر لیتے ہیں۔

مولانا پاریکھ صاحب گو ایک بڑے تاجر کے روپ میں سامنے آئے مگر یہ حقیقت ہے کہ ان کا حقیقی مشن اور میدان دعوت و تبلیغ اور تفہیم قرآن تھا، وہ روایتی طور پر عالم دین نہیں تھے نہ انہوں نے کسی مدرسہ میں عربی وغیرہ کی تعلیم باقاعدہ حاصل کی تھی، ہاں البتہ انہوں نے مولانا عبدالسلام قدوائی کی ابتدائی عربی تصانیف اور ان کے الفاظ و معانی کو حفظ کر لیا تھا، قرآن حکیم کو انہوں نے اپنا مشغلہ بنالیا تھا، قرآن کی آیتوں سے وہ برمحل استدلال کرتے تھے، ان کی تقریر قرآن کے بیان کردہ ضابطوں اور تشریحات کے مطابق ہوتی تھی، اس لئے وہ قرآن کے تقریباً حافظ ہو گئے تھے، برادرانِ وطن میں اسلام کی تبلیغ کیلئے وہ بے چین رہتے تھے، ایک عام آدمی سے لے کر نائب صدر جمہوریہ سرکردہ عہدیداران اور مذہبی قائدین کو انہوں نے اسلام کی دعوت پیش کی، چناں چہ سابق نائب صدر کرشن کانت ان سے از حد متاثر تھے، ۱۹۷۳ء میں شہر ناگپور کے اندر انہوں نے ایک اعلیٰ سطحی کانفرنس بھی بلائی جس میں مشاہیر ملت کے علاوہ ہندوؤں کے سرکردہ افراد موجود تھے، مولانا پاریکھ نے قرآن کریم کی آیتوں سے استدلال کرتے ہوئے ایسی مؤثر تقریر فرمائی کہ گاؤکشی کے مخالفین مبہوت ہو کر رہ گئے، یہ ان کی خوش نصیبی رہی کہ انہیں بتوفیق الٰہی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جیسا محسن و مربی اور روحانی مرشد مل گیا جن کی سرپرستی اور رفاقت سے مولانا پاریکھ کی شخصیت میں نکھار پیدا ہوا اور وہ تیز گامی سے ملی کاموں کو سرانجام دیتے رہے۔ مولانا پاریکھ نے دعوت کو اس کے وسیع تناظر میں سمجھا اور اسی طرز پر انہوں نے اپنا مشن جاری رکھا، افسوس کہ ان کا وقت موعود آپہنچا وہ

اپنی آنکھوں میں بہت سے خواب سجائے اس دنیا سے رخصت ہو گئے، جب کہ ملک وقوم کو ابھی ان کی ضرورت تھی، لعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً۔

جیسا کہ ماقبل میں ذکر کیا گیا کہ قرآن فہمی میں انہیں خاص درک حاصل تھا، قرآن کی تفسیر وہ دل نشین انداز اور عمدہ اسلوب میں کرتے تھے، ان کے مخاطب سبھی طرح کے تھے، مگر انہوں نے سہل زبان اختیار کی، تاکہ ہر خواص وعام برابر مستفید ہو سکے، بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقہ تو ان کے تفسیری نکات پر عش عش کرتا، انہوں نے وقتی تقاضوں اور ضرورتوں کو بخوبی محسوس کیا اور ''تشریح القرآن'' کے نام سے ایک تفسیر لکھی جو ان کی ۴۵ رسالہ جد وجہد کا نتیجہ ہے، علاوہ ازیں ''تفسیر خزانہ'' آسان لغات القرآن، قوم یہود اور ہم جیسی متداول کتابیں ان کے گہربار قلم کی رہین منت ہیں۔ دینی موضوعات پر بھی انہوں نے لکھا اور قارئین سے خراج تحسین وصول کیا، ان کی دیگر کتابیں مومن خواتین، قرآن مجید بہنوں کی نجات وغیرہ ہاتھوں ہاتھ لی گئیں اور لوگ برابر ان سے استفادہ کر رہے ہیں، مولانا پاریکھ فی الحقیقت نبض شناس تھے وہ جانتے تھے کہ قوم کو اس وقت کن مسائل ومصائب کا سامنا ہے اور ان کے لئے اس وقت کیا لائحہ عمل تیار کرنا چاہئے، اس معاملہ میں وہ ذرا بھی غفلت کا شکار نہیں ہوئے، بلکہ ہر وقت وہ ہراول دستہ میں نمایاں طور پر شامل رہے، وہ اختلاف کے بجائے اتحاد پر یقین رکھتے تھے اور اتحاد کا پرچم ان کے ہاتھ میں نظر آیا، اچھے اچھے لوگ لرزے قدم ڈگمگائے مصلحت کا شکار ہوئے، مگر مولانا پاریکھ تھے کہ کبھی پیچھے نہ ہٹے۔ ان کے پایۂ استقامت میں کبھی لرزہ پیدا نہ ہوا اور نہ رعشہ، وہ اپنی انہی گوناگوں خوبیوں سے آراستہ رہے، اسی لئے وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے رکن اساسی اور ایک زمانہ تک اس کے خازن بھی رہے، ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس انتظامی کے رکن رکین مسلم مجلس مشاورت کے ذمے دار، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ممبر آف

کورٹ اور مجلس تعلیم القرآن ناگپور کے مؤسس اور سرپرست تھے، ان کی دردمندی اور جگرسوزی، جذبات میں لطافت تقریر وتحریر میں انفرادیت نے ان کی عبقری شخصیت کو ایک نئی راہ دی، وہ اسی درمندی اور جگرسوزی کے ساتھ دعوت وتبلیغ کے مشن سے وابستہ رہے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے بیعت واجازت بھی حاصل تھی، اوران کے سب سے بڑے خلیفہ ومسترشد اور جانشین مگران کی تواضع کسرنفسی اور قنائیت دیکھئے کہ مفکر اسلامؒ کی رحلت کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ ہم سب کے بزرگ وبڑے اب حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ ہیں، ہم انہی کو اپنا پیشوا اور قائد تسلیم کرتے ہیں، پھر اعلان ہی نہیں مولانا پاریکھؒ اس پر عمل پیرا رہے اور حضرت مولانا محمد رابع ندوی سے برابر تعلق قائم رکھا، افسوس کہ زندگی کے آخری مرحلہ میں وہ بصارت سے محروم ہوگئے تھے، مگر فضل ربی کہ ان کی بصیرت کے چراغ یوں ہی جلتے رہے اور ملک وملت کا درد وشعور رکھنے والے ان کے اردگرد پروانہ وار جمع رہے۔

مولانا پاریکھ صاحبؒ کے سانحہ ارتحال کی کسک تمام طبقوں میں غیر معمولی طور پر محسوس کی گئی اور ملت کے اس بے لوث خادم اور سچے سپاہی کو خراج عقیدت پیش کیا اور ان کے انتقال کو حادثہ فاجعہ سے تعبیر کیا، سرکردہ علماء اور قومی وملی رہنماؤں وسیاست دانوں نے انہیں گلہائے عقیدت پیش کئے، اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت ومغفرت کے گھنیرے سائبان عطا کرے، آمین۔

(بہ شکریہ ماہنامہ محدث عصر بابتہ ماہ اگست، ستمبر ۲۰۰۷ء)

فخر المحدثین، شگفتہ خطیب

حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ

حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ علم وعمل اور فکر وادب کی نمائندہ شخصیت تھے، ان کا وجود باعث فخر تھا، تمام علمی محفلوں ومجلسوں میں ان کی دلآویز شخصیت ناظرین کا من موہ لیتی تھی اور ہر جگہ وہ اپنی خوشگوار انفرادیت کے پیکر تراشتے تھے، وہ قلم کے بادشاہ تھے اور شگفتہ نثر لکھتے تھے انکےاسلوب اور منفرد لب ولہجہ میں کوثر وتسنیم میں ڈھلی ہوئی ان کی باوزن تحریریں اور نگارشات باذوق قارئین کو سیراب کرتی رہیں گی، شاہ جیؒ نے تحریر وانشاء میں نئی جہتیں پیدا کیں وہ یکتائے روزگار صاحب قلم تھے، خشک سے خشک تر مضمون کو بھی انہوں نے شادابی سے بغل گیر کردیا اور قاری کو مسحور کردیا وہ خوش فکر اور پاکیزہ خیال کے عالم دین تھے، ان کی تحریر وتقریر میں جابجا اس کا احساس ہوتا ہے، گذشتہ نصف صدی سے زائد مدت سے لکھنا پڑھنا ان کا بچھونا تھا اور اس کے بغیر انہیں قرار نہ تھا، زندگی کے کسی بھی حادثہ نے ان کے اس عمل کو متاثر نہ ہونے دیا، حتی کہ جاتے جاتے اپنے علمی وتحقیقی مجلہ ''محدث عصر'' کا اداریہ بھی املاء کرا گئے، قومی اور بین الاقوامی حالات پر گہری نظر تھی، عالم اسلام کی زبوں حالی پر بہت کڑھتے تھے اور اپنی فکر مندی کا اظہار بھی کرتے، مگر جذباتی نعروں کے بجائے تعمیری کردار ان کا شیوہ رہا، حضرت شاہ صاحبؒ کی زندگی بے شمار خوبیوں سے عبارت ہے وہ عظیم باپ کے عظیم بیٹے تھے، ان کے نامور والد حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ اپنے زمانہ کے لاثانی محدث تھے اگر اسلام کے ابتدائی زمانہ میں بغداد کے جامعہ نظامیہ نے غزالی جیسے باتوفیق طالب علم کو امام غزالی بنایا تو بلاریب دار العلوم دیوبند

نے بھی مولانا انور شاہ کشمیریؒ جیسا بے مثال محدث پیدا کیا، دارالعلوم نے اپنے قیام کے بعد شبلی وجنید جیسے علم وعمل اور فضل وکمال کے پیکر تراشے، دارالعلوم کے انہی ارباب فضل وکمال کی موجودگی میں مولانا سید انظر شاہؒ نے آنکھیں کھولیں، ابھی چار سال کے تھے کہ والد گرامی نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور شاہ صاحبؒ کو یتیمی کے داغ سے دوچار ہونا پڑا، کفالت کے اسباب بہ ظاہر ندارد تھے، ان کے والد مرحوم نے ہونہار اور فخر روزگار شاگردوں کی ایک جماعت تیار کی تھی ان میں شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی جیسے مربی ورہنما آپ کو مل گئے، بالخصوص شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی نے آپ کی شخصیت سازی میں نمایاں فریضہ انجام دیا، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی جو علم وادب کا مرکز تھا، مفسر قرآن حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی سرپرستی بھی نصیب ہوئی، جدید علوم کی طرف رجحان غالب تھا، اس لئے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے کر مختلف امتحانات پاس کئے، انہیں دنوں ہند پاک کے بٹوارے کو لے کر فسادات ہوئے تو شاہ صاحب دیوبند واپس آ گئے اور پھر دارالعلوم دیوبند سے عالمیت کی تعلیم حاصل کی اور امتیازی نمبرات سے کامیاب قرار پائے، ابتدائی ہی سے نہایت ذہین وفطین اور بے پناہ قوت یادداشت کے مالک تھے اپنے قابل رشک حافظہ کی بنیاد پر انہوں نے علوم الحدیث والقرآن کو بڑی حد تک مستحضر کر لیا تھا، اکابر دارالعلوم کے علمی ورثہ کے وہ دائرۃ المعارف تھے، انہیں حضرت تھانویؒ کے افادات وواقعات زبان زد تھے اس لئے جب بھی وہ گفتگو کرتے تو مجلس کو حضرت تھانویؒ کے واقعات ولطائف سے زعفران زار بنا دیتے، عوام وخواص کو مقتضی حال کی رعایت کرتے ہوئے اپنے جادوئی بیان کا اسیر بنا کر چھوڑتے، ان کے علمی دبدبے کی دھاک معاندین کے دلوں پر بھی بیٹھی ہوئی تھی، اس کے باوجود تفاخر وتعلّی سے شدید نفرت رہی اور دوسروں

کے ساتھ نہایت ادب وخندہ پیشانی سے ملتے اور اجنبیت کا احساس تک نہ ہونے دیتے۔

حضرت شاہ صاحبؒ بڑے باپ کے بیٹے ضرور تھے اور بلاشبہ عظیم نسبت کے مالک تھے مگر انہوں نے اپنا میدان خود ہی بنایا مسلسل کوشش ومحنت کر کے علوم انوری کو سمیٹا اور والد گرامی کا نام زندہ رکھ کر خود بھی فخر خاندان بنے۔

شاہ جیؒ کے تذکرہ جمیل کے لئے قلم وکاغذ کا ایک دفتر چاہئے وہ شش جہت شخصیت کے مالک تھے ارباب فکر وادب اور اہل قلم ان کی علمی، تحقیقی اور سماجی خدمات پر لکھیں گے، ان کے تعلیمی، تدریسی فکری اور سیاسی رجحانات کا شرح وبسط سے جائزہ لیں گے تو علم وتحقیق کا ایک انسائیکلو پیڈیا تیار ہوگا اور بلاشبہ یہ ایک فریضے کی ادائیگی بھی ہوگی۔

شاہ صاحبؒ اپنے بے پناہ قوت حافظہ وسعت مطالعہ اور رسوخ فی العلم کی وجہ سے مرجع علماء تھے طلبۂ حدیث اساتذہ مدارس علم وادب سے دلچسپی اور وابستگی رکھنے والے باکمال اشخاص بھی ان کے اردگرد پروانہ وار جمع رہتے، حتی الامکان ان سے بھرپور استفادہ کے مشتاق رہتے اور بامراد ہوکر لوٹتے خود شاہ صاحب افادہ واستفادہ کی تلاش میں رہتے، راقم الحروف کا مشاہدہ ہے ابھی چند سال پیشتر مشہور گہوارۂ علم وادب ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سابق معتمد تعلیمات اور متعدد کتابوں کے مصنف مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی مرحوم دارالعلوم دیوبند تشریف لائے انہوں نے اپنے دورۂ دارالعلوم کو صیغۂ راز میں رکھا وہ بہت جلد یہاں سے رخصت ہوا چاہتے تھے کہ چند بنگلہ دیشی طلبہ نے جو ندوہ سے فراغت کے بعد یہاں دورۂ حدیث پڑھنے کیلئے رہائش پذیر تھے حضرت شاہ صاحبؒ کو ان کی آمد سے مطلع کر دیا، شاہ جیؒ نے فوراً مولانا ندوی مرحوم کو بلوا بھیجا اپنے گھر بیت الحکمت میں ان کا والہانہ استقبال کیا اور پر تکلف ناشتہ تیار کرایا دونوں کے مابین علمی تبادلۂ خیال ہوا قرآنی علوم گفتگو کا موضوع تھا، شاہ جیؒ نے مولانا ندوی کے استفسار پر ایسے

نکات اور رموز واسرار پر روشنی ڈالی کہ موقر مہمان بھی عش عش کرنے لگے، بعد میں مولانا عبداللہ عباس ندوی نے تعمیر حیات میں اپنی روداد سفر تحریر فرمائی تو اس علمی ملاقات کا بطو رخاص تذکرہ کیا، اغلباً ان دونوں بزرگوں کی یہ پہلی بالمشافہ ملاقات تھی، حضرت شاہ جیؒ مرنجاں مرنج شخصیت کے مالک تھے، بسا اوقات ایسے جملے ادا کرجاتے کہ مجلس زعفران زار ہوجایا کرتی تھی اور اہل مجلس لوٹ پوٹ ہوجاتے تھے، وہ بڑے ظرافت پسند تھے جس کا مشاہدہ جابجا ہوتا، زبان میں چاشنی اور حلاوت ہوتی بولتے کیا بس رس گھولتے تھے ،خود بھی ہنستے دوسروں کو بھی ہنساتے ، باتوں ہی باتوں میں بہت دلچسپ واقعات بیان کردیتے، ان کی مجلس کے حاضر باش کبھی بھی مایوسی یا پژمردہ نہ ہوتے، بلکہ ہر لحظہ تبسم اور مسکراہٹ سے صدر مجلس کو اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ،ان کی مجلس میں دینی وسیاسی ذہن رکھنے والے ہر قسم کے لوگ ہوتے اسی لئے آپ ایسا موضوع اختیار فرماتے کہ ہر ایک کیلئے یکساں طور پر مفید ہوتا۔

حضرت شاہ جیؒ سلطان القلم تو تھے ہی لیکن اس سے کہیں زیادہ خطابت کے میدان میں ان کا سکہ چلتا تھا، ماضی قریب کے جن علماء نے اس میدان میں اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں اور خطابت میں نئی سمتیں پیدا کیں ان میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ، سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ، مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ اور مولانا منظور نعمانی سرفہرست بلکہ اس میدان کے شہسوار رہے ہیں، ہمارے شاہ صاحبؒ نے ان حضرات کو گویا اپنے اندر سمولیا تھا بڑے پیارے انداز واسلوب میں وہ تقریر فرماتے اور اپنے خطاب کا جادو جگاتے تھے، گھنٹوں گھنٹوں تقریر کرتے اور سامعین کو معلومات بہم پہنچاتے

کاتب الحروف نے اپنے دیوبند کے ۹رسالہ مدت قیام میں ان کو خوب سنا یہاں تک کہ علمی وادبی فضاء میں ان کی زبان وبیان کی شہرت آفتاب نصف النہار پر تھی، صرف دیوبند ہی نہیں اس وقت سرزمین ہند پر ان کے قد کا کوئی خطیب نہیں تھا، کوئی بھی موضوع ہوتا وہ بالکل پریشان نہ ہوتے، گویا تمام مضامین انہیں ازبر تھے، چند سال ہوئے جناب حامد تحسین دیوبندی کی کتاب پتھر کی کہانی کا رسم اجرا آپ نے فرمایا تو پتھر کی پوری تاریخ بیان کرڈالی، اور افادات کا ایک سمندر انڈیل دیا، ایسے مواقع پر شاہ صاحبؒ آتش جوالہ بن جاتے، مجمع زیادہ ہوتا تو ان کے خطیبانہ تیور اور بدل جاتے، زبان نہایت فصیح وبلیغ استعمال کرتے، فصاحت وبلاغت کے آب شاران پر جانثار بلکہ شاعر کی زبان میں تھوڑی سی ترمیم کی معذرت کے ساتھ کہ:

فصاحت جھومتی تھی ان کے انداز تکلم پر　　　لب اعجاز پران کی بلاغت ناز کرتی تھی

زمیندار کے مدیراور شاعر ظفر علی خاں مولانا انظر شاہ کشمیریؒ کا جادوئی اور اپنی رو میں بہالیجانے والا بیان سن لیتے تو برجستہ یہ کہنے پر مجبور ہوتے کہ:

بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

افسوس! شاہ جی کی رحلت کے بعد فن خطابت جوانہی کی ذات کا حصہ تھا اپنی انتہاء کو پہنچ گیا اور خطابت کے ایک زریں عہد کا خاتمہ ہوگیا۔

یوں تو ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

مقرر اور خطیب بہت سے مل جائیں گے مگر شاہ صاحبؒ جیسا سحر انگیز اور منفرد لب ولہجہ کا مقرر اب کہاں، تدریسی حلقے بھی قائم ہوں گے، علمی وادبی نشستیں بھی منعقد ہوں گی، جلسے جلوس بھی ہوں گے مگر شاہ جیؒ کی عدم موجودگی محفلوں کو بے رونق اور آنکھوں کو اشک بار

کرتی رہے گی

ع

حیف! ہے وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا

یادگار رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

شاہ صاحبؒ جیسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کے ذریعہ خیر کے اتنے کام انجام پاتے ہیں کہ عقلیں حیران رہ جاتی ہیں، بڑے بڑے تحقیقاتی ادارے، علمی اکیڈمیاں اور ہزار ہا افراد وہ خدمت انجام نہیں دے سکتے جو اللہ تعالیٰ اپنے بعض مخلص اور منتخب بندوں سے کرا لیتے ہیں، الحمدللہ تحریک دیوبند اس کی زندہ اور روشن مثال ہے، اس کے بانی ان کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد واقعی دین اسلام کے بے لوث خادم اور سچے سپاہی تھے، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ، امام المحدثین مولانا انور شاہ کشمیریؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے اساطین علم وفضل اس تحریک کی سنہری کڑیاں ہیں، دارالعلوم دیوبند کی یہ خوش نصیبی رہی کہ شریعت محمدی کے فروغ اور تحفظ کو اس نے اپنا موضوع اور مقصد بنایا، شمع رسالت کے پروانے تیار کئے اور آج وہ اسی سمت میں محوِ سفر ہے، دشمنان اسلام کی انڈر گراؤنڈ اسکیمیں اور اپنوں کی بے پناہ عداوتوں نے اسے راہ مستقیم سے ہٹانے کی حتی الامکان کوششیں کیں مگر اس کے پایہ استقامت میں کوئی رعشہ دیکھنے میں نہیں آیا، دارالعلوم دیوبند نے یہی پیغام اپنے فرزندوں کو دیا، شاہ جیؒ بھی دارالعلوم کے ایک فرزند تھے، وہ زندگی بھر فکر قاسمی کے نقیب وترجمان رہے، ان کے فکر میں جمود نہیں تھا وہ نہایت روشن خیال، خوش فکر اور وسیع النظر عالم تھے، زبان اور قلم دونوں کو اشاعت دین اور دفاع عن الحق کے لئے استعمال کیا، تقریراً دو درجن عربی واردو کتابیں ان کے گہربار قلم سے نکلیں جس سے علم وادب میں خوشگوار اضافہ ہوا، پھر ہزاروں کی تعداد میں ان کے کامیاب شاگرد خدمت دین میں مصروف کار ہیں، دارالعلوم

دیو بند میں وہ محدث ہونے کے علاوہ تعلیمات اور دوسرے شعبوں کے ذمے دار رہے، دارالعلوم کی تقسیم کے بعد وہ دارالعلوم وقف کے بانیین میں شمار ہوئے اور وہاں تعلیمات وصدر مدرسی کے فرائض انجام دے رہے تھے، بخاری شریف کا کچھ حصہ ہمیشہ انہی کے پاس رہا، دارالعلوم وقف کو انہوں نے اپنے خون جگر سے سینچا اور اس کی ہمہ جہت ترقی کیلئے کوشاں رہے، شاہ صاحبؒ قدیم صالحیت اور جدید نافعیت کے قائل تھے، عصر حاضر میں پیدا شدہ احوال سے انہوں نے آنکھیں نہیں موندیں، بلکہ چشم کشا اور نباض وقت ہونے کا احساس دلایا، عصری تقاضوں کے پیش نظر نیز اپنے والد گرامی کے علمی وادبی شہ پاروں کو منصۂ شہود پر لانے کی غرض سے جامعۃ الامام محمد انور کی داغ بیل ڈالی اور اہل علم کو بھی ادھر متوجہ فرمایا، آج ان کا لگایا ہوا یہ شجرہ طوبیٰ برگ وبار سمیت پھل پھول رہا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی رحلت کے بعد اب ذہن کی اسکرین پر ان کی تصویر آتی ہے تو ان کی بہت سی یادوں کے چراغ جل اٹھتے ہیں، ان کی موت موت العالم کی مصداق ہے، ان کے انتقال سے دارالعلوم دیو بند، دارالعلوم وقف دیو بند اور جامعہ انور کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ طلباء پر تو وہ زیادہ ہی شفیق تھے اور ان کے مستقبل کی زلفوں کے سنوارنے میں آگے آگے رہتے، ۲۰۰۱ء میں جب انہیں صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام نے صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازا تو خاکسار نے ان کی علمی خدمات پر ایک مضمون قلم بند کیا، جو مختلف رسائل کے علاوہ ماہنامہ محدث عصر نے بھی شائع کیا، حضرت شاہ صاحبؒ نے جیسے ہی ملاحظہ فرمایا تو دارالعلوم دیو بند کے استاذ جناب مولانا خضر محمد کشمیری حفظہ اللہ سے راقم کی بابت معلوم کیا اور دعائیں دیں، احقر ان کا باضابطہ شاگرد تو نہیں ہے مگر ان کے چند اسباق سننے کی توفیق ہوئی، حدیث کی تفہیم وتشریح پر ایسا جامع کلام کہ طبیعت خوش ہو جاتی، دوران سبق علامہ کشمیریؒ، مولانا مدنیؒ، ابن حجر عسقلانیؒ، ابن تیمیہ اور ابن القیم وغیرہم کی آراء

سامنے لاتے، ہر رطب ویابس کو بیان کرنے سے وہ کوسوں دور رہتے۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، بچپن سے قوت یادداشت کی دولت پائی تھی، تین چار سال کی عمر بھی کوئی عمر مگر تمام تر باتیں انہیں یاد تھیں، ابھی تقریباً ۲۵/ ۳۰/ روز قبل جب کہ انہیں افاقہ تھا۔ بندہ ناچیز ان کے دولت کدہ پر حاضر ہوا علیک سلیک کے بعد محترم مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب نے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ کھجناور ضلع سہارنپور سے تعلق رکھتے ہیں، شاہ صاحبؒ فوراً ماضی کے اوراق میں گم ہوگئے اور بولے کہ میں چار سال کی عمر میں فلاں باجی سے ملنے کھجناور گیا تھا ایسا یاد پڑتا ہے کہ وہاں کی آبادی نشیب وفراز اور غیر ہموار زمین میں پھیلی ہوئی تھی، کیا اب بھی ایسا ہی ہے، احقر نے اثبات میں جواب دیا۔

ان کی اس حیرت انگیز یادداشت کی پختگی سے میرے استعجاب کی انتہا نہ رہی، واقعی دنیا اس طرح کے مثالی لوگوں سے اب محروم ہو رہی ہے، شاعر نے بڑے پتے کی بات کہی کہ:

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں — کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی

شاہ صاحبؒ کی ظاہری عملی زندگی جتنی پرکشش تھی اور وہ حقوق العباد کی ادائیگی کے لئے جتنے توانا تھے اس سے کہیں زیادہ انہوں نے اپنی باطنی کیفیات کو جلا بخشی، مگر کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہوئی، انہوں نے سلوک واحسان پر نظر رکھی اور حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نیز حضرت مولانا محمد انوری لائلپوریؒ سے بھرپور استفادہ کیا، وہ اکابر دارالعلوم کی آخری یادگار تھے، اللہ انہیں اپنے شایانِ شان رحمت ومغفرت کے سائبان عطا کرے اور ان کے زلات سے درگذر فرمائے، آمین۔

زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا — تم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

(یہ مضمون ماہنامہ ''ترجمان دیوبند'' بابتہ ماہ جون ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا)

حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ کا

نثری بیانیہ

احقر کاتب الحروف کے مطالعہ کی میز پر یکتائے روزگار محدث اور سحر طراز نثر نگار مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیریؒ (متوفی ۲۶/اپریل ۲۰۰۸ء) کے شاداب قلم فیض رقم کی مرہون سردست دو کتابیں لالہ وگل اور نقش دوام پیش نظر ہیں، جن کی افادیت کا جادو گردشِ شام وسحر اور مرورِ ایام کے باوصف سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اول الذکر کتاب کے مشمولات ان زائد از ساٹھ کاروانِ دین ودانش کا تذکرہ جمیل ہے جن کے پڑھنے اور سننے سے خزاں رسیدہ چمن میں بہارِ نوعود کر آتی ہے اور گلشن حیات کا پتہ پتہ مسکرانے لگتا ہے، ان اصحاب تذکرہ افراد میں دین وادب، دانش وآگہی، تہذیب وثقافت اور سیاست وسماج کی وہ نمائندہ نامی گرامی ہستیاں بھی ہیں جن کے مختصر سے وجود میں خلاق عالم نے اپنے جواہر وحکم کے بے شمار خزانے ودیعت فرمادئے تھے، ان عزت مآب نفوس کی حکایات ہستی کو مولانا سید انظر شاہ کشمیری نے تحریر وانشاء کے ایسے دل آویز قالب میں ڈھال دیا ہے کہ اب دیر اور دور تک ان کے زندہ وتابندہ رہنے کی قوی تر امید ہے۔

جبکہ مؤخر الذکر کتاب مصنفِ باکمال کے شہرت پذیر والد گرامی امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے سوانح، علمی وعملی رجحانات، سیاسی افکار وخیالات، دینی نظریات اور تحقیقات وتفردات کا ایسا حسین شاہ کار ہے کہ اس کی دستاویزی واستنادی

حیثیت اصحاب لوح وقلم کے نزدیک مسلم الثبوت ہے، ۶۲۴ صفحات پر حاوی نقش دوام کا یہ متذکرہ ایڈیشن صاحب سوانح کی شخصیت کا بہترین سراپا ہے جو محض ایک روایتی سوانح حیات نہیں بلکہ امام العصر علامہ کشمیریؒ کی مختلف النوع کرشماتی شخصیت کا بہترین آئینہ ہے، اس آئینہ کی وساطت سے ہم ان کے شخصی، علمی، فکری، تحقیقی اور سماجی جغرافیہ سے نہ صرف آشنا ہوسکتے ہیں بلکہ ان کی تابناک زندگی سے اسرار حیات بھی معلوم کرسکتے ہیں اور بلاشبہ یہی وہ رموز واسرار ہوتے ہیں جو زندہ قوموں کو فلاح وترقی کی معراج کراتے ہیں، جہاں پہنچ کر حضرت انسان کبر ونخوت کا شکار نہیں ہوتا بلکہ اسرار خودی وخودشناسی اسے خداشناس بنادیتے ہیں، تاآنکہ وہ علم ومعرفت کی دولت گرانمایہ سے فی الحقیقت ہم عناں بھی ہوتا ہے اور مومنانہ صفات اس کی طرف اس طرح لپکتی ہیں جیسے مقناطیس آہن پاروں کی جانب۔

چنانچہ مذکورہ ہر دو کتب سیرت وسوانح اور افکار وآثار کا حسین مرقع ہیں۔ جن کے جملہ مضامین آمد کا نتیجہ ہیں۔ آورد کا کہیں بھی اور کبھی بھی بالکل احساس نہیں ہوتا۔ مولانا کشمیری کے رشحات قلم ان کے دل کی تراوش ہے، جو حق وصداقت کا خوبصورت اعلامیہ ہے۔ ان میں جوش ہے، ابال ہے، حرکت وفعالیت ہے، غیرت وحمیت کی للکار ہے، جذبۂ اندرون کی حسین صدائیں ہیں، سمندر کی گہرائی اور صحرا کا سکون ہے، گفتار ورفتار میں نرمی بھی ہے اور سبک خرامی بھی، شعلہ بھی ہے اور شبنم بھی، اظہار حقیقت بھی ہے اور دیانت کا اعتراف بھی، فاضل مصنف اپنے ممدوحین کے دلگداز قصیدے سناتے ہیں لیکن بے سروپا نہیں، عقیدت والفت کا اظہار کرتے ہیں مگر حد اعتدال سے نہیں ہٹتے، زبان وبیان میں بڑی ندرت ہے، جملوں کی تراش خراش اور انتخاب تعبیرات میں ید طولیٰ حاصل ہے، لگتا ہے کہ جملوں کا برمحل شتابی استعمال مولانا مرحوم کا وصف خاص تھا۔ وہ بے تکلف لکھتے بھی اور املا بھی کراتے، یہی بے تکلف استعمال مذکورہ کتابوں میں مکمل طور پر موجود ہے جس

سے مطالعہ کی لذت دوآتشہ ہوگئی ہے اور قاری کی شکم سیری بلکہ علم پروری کا بھرپور سامان بھی۔ ہر کتاب کی ہر سطر فاضل قلم کار کے ذوق جمال وحسن اظہار کی شہادت دیتی ہے۔

عہد حاضر کے نامور نقاد حقانی القاسمی کا شاہ جی کے نثری ادب کے سلسلہ میں بطور شہادت ذیل کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمایئے!

''انظر شاہ کشمیری کی نثر میں طلسمی کیفیت ہے، اردو میں ایسی پردم اور بلند آہنگ نثر لکھنے والے کم ہیں، جن کے جملوں کے زیر وبم اور موسیقیت سے وہ اذہان بھی متاثر ہوتے ہیں جولفظوں کے معانی ومفاہیم تک رسائی سے قاصر رہتے ہیں، ان کی نثر کی رمزیت اور اسراریت میں وہ کیفیت ہے کہ قاری اس کے سحر سے نکل نہیں پاتا، اور اس کا ذہنی وجود نثر کی موج رواں میں جذب ہوکر رہ جاتا ہے''۔(دارالعلوم دیوبند کا ادبی شناخت نامہ، ص:۷۸-۷۹)

حضرت شاہ صاحبؒ کے زرخیز حافظہ، وسیع مطالعہ، قوی مشاہدہ، مستحکم طرز استدلال، مدلل ومبرہن کلام اور شگفتہ انداز بیان نے ایسا مواد فراہم کیا ہے کہ بار بار پڑھنے سے بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی، ہل من مزید کی صدائیں بلند ہوتی مسموع پڑتی ہیں، شاہ جیؒ کی تحریریں ان کے بلند تخیل کی پیداوار ہیں۔ وہ قادرالکلام نثر نگار اور زور آور انشاء پرداز تھے۔ان کی ابحاث علمی بھی ہیں، تحقیقی بھی ہیں اور سوانحی بھی۔ جس موضوع پر چاہتے ہیں دلائل وبراہین کے انبار لگادیتے ہیں، انہیں نہ تکان ہوتی اور نہ افسردگی کا احساس، ہمہ وقت ان کا خیال بلندیوں کو چھونے، آفاقیت کو سمیٹنے اور مسائل لاینحل سے نپٹنے کا رہتا ہے جس کا ادراک مذکورہ کتب سے بھی ہوتا ہے۔حقائق کو واشگاف کرنا، دقائق کو بیان کرنا اور واقعات ونوازل سے صحیح نتائج کا استخراج ان کا وجدانی پہلو ہے جس میں ان کی جمالیاتی حس اور ذکاوت وموزونیت کا بڑا دخل ہے۔وہ مسائل وحوادث سے الجھتے ہی نہیں بلکہ تریاق بھی

فرماتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کی نثر نگاری وانشاء پردازی کی تفہیم وتشریح بھی دراصل انہی لوگوں کے بس کی بات ہے جو بذات خود اچھے نثر نگار اور صاحب فن ہوں، یہ تہی دامن اور کوتاہ قلم کیا عرض کرتا لیکن تعمیل ارشاد اور خیال خاطر اکابر کے مدنظر یہ چند بے ربط سطور صفحۂ قرطاس پر منتقل کر رہا ہے جس سے بحیثیت نثر نگار انظر شاسی کا تحرک پیدا ہوسکتا ہے، علی الخصوص اس لئے بھی کہ آپ کے یہاں طرز تحریر اور نثر وانشا نگاری میں تخلیقیت کا بے پناہ وفور ہے، علمی خانوادے کے چشم وچراغ اور نامور والد کے سعید بیٹے تو تھے ہی اس پر مستزاد شروع ہی سے لکھنے لکھانے کا معمول و بے پناہ جذبہ، چنانچہ معروف ادیب اور ممتاز صاحب قلم مولانا مناظر حسن گیلانیؒ آپ کے ایک خط کے جواب میں ارقام فرماتے ہیں:

''ہر شخص کے رجحان، افتادِ طبع، اس کی اندرونی صلاحیتوں کی نوعیت کو معلوم کرنے کیلئے صرف چند سطریں ارباب نظر کے نزدیک کافی ہوتی ہیں، خاکسار نے آپ کی کوئی مستقل تحریر تو نہیں دیکھی ہے، صرف متعدد مکاتیب ہی سے سرفراز ہوا ہوں، لیکن ان خطوط میں بھی جو میں نے پایا ہے اس کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ''اسلام'' کی خدمت قلم کی راہ سے ان شاء اللہ آپ آئندہ کریں گے اس کی توفیق آپ کو بخشی جائے گی اور گو چھوٹا منھ بڑی بات ہے لیکن کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں کشمیر کے سادات کے ایک خانوادے کو خصوصی اہمیت حاصل ہونے والی ہے'' (لالہ وگل ص ۱۰۰)۔

ملک کے ایک مایۂ ناز اہل علم وقلم کی یہ پیشن گوئی بلکہ شہادت اس زمانہ کی ہے جب آپ کے قلمی سفر کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔ پھر رب دوجہاں نے وہ دن بھی دکھایا کہ آپنے حضرت علامہ کشمیریؒ کے نام اور کام کو آگے بڑھایا اور اپنے معاصرین میں انفرادیت کے چراغ روشن کئے، زبان وقلم کی راہ سے آپ کی وقیع خدمات آب زلال سے مرقوم ہوں گی

اور وقت کا مورخ ان کارہائے نمایاں سے صرف نظر نہ کر سکے گا۔

خیر یہ گفتگو تو بطور جملہ معترضہ کے تھی۔ اصل بات نقش دوام اور لالہ وگل کے محتویات و مشتملات کے تعلق سے چل رہی تھی کہ شاہ صاحب کے تحریری بانکپن اور نثری اسلوب کا رنگ و آہنگ ان کی کتابوں کے مطالعہ سے بخوبی ہوجاتا ہے، مثلاً لالہ وگل میں شامل مضامین کی اشاعت کا آپنے ارادہ کیا تو ''خامہ فرسائی'' کے عنوان کے تحت یوں رقم طراز ہوئے ''کہاں گئے دوست احباب؟ کس دنیا کے باسی ہیں شفیق ماں باپ؟ یہ عورت کا سہاگ کس نے لوٹا؟ یہ شوہر کی خانہ ویرانی کس نے کی؟ یہ بچے کیوں یتیم ہوگئے؟ یہ شادآباد گھرانہ آج ماتم کدہ ہے؟ کیا کہہ گیا اور کیسی سچی بات وہی اردو کا مشہور شاعر جس نے عروج کے بعد زوال دیکھا، جسے امارت کے بعد فلاکت نے گھیرا یعنی ان شاء اللہ خاں انشاء ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب تیار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

آہ! غفلتوں کا پشتارہ اس پر خدا تعالیٰ کی جانب سے انتباہ و ایقاظ، حالانکہ عبرت پذیر دل و دماغ نے ہر لمحے کی آمد و رفت کو بھی درس عبرت قرار دیا ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی ایک اور گھٹادی

پھر آگے لکھتے ہیں:

''اپنے بزرگوں، اپنے اکابر، جانی پہچانی شخصیتوں اور متعارف افراد و اشخاص پر یہ مضامین قلم بند ہوئے، خدا جانے کن کن مجلّات و جرائد کیلئے اور کہاں کہاں کے اخبارات و رسائل میں شاید قدرت انہیں محفوظ رکھنا چاہتی ہے کہ عزیز قلبی خادم زادہ مولوی احمد خضر سلمہ

کو خیال ہوا کہ جمع ترتیب کے بعد ان کی طباعت کا سروسامان ہو کارساز حقیقی کی چارہ سازیاں کہ طویل وسنگلاخ مراحل سے گذر کر اب یہ مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے''۔

لالہ وگل میں جن شخصیات پر طبع آزمائی کی گئی ہے ان میں سے بعض کے نام آپ کے خطوط پھر ان کے جوابات جو مکتوب الیہ کی جانب سے وارد ہوئے، مندرج ہیں ان خطوط کا پس منظر بھی شامل کتاب ہے جس کے تعلق سے آپ لکھتے ہیں:

''ہر مکتوب کے پس منظر کو لانے کے لئے قلم گھسنے کی ضرورت تھی سو وہ اس کم سواد نے انجام دی، مہم تو سر نہ ہو سکی لیکن کچا چٹھا آپ کے روبرو ہے، نگاہ خوردہ گیر سے بھی پناہ مانگتا ہوں اور مبالغہ آمیز مدح سے بھی اگر یہ مجموعہ قابل قبول ہے تو رحمت رحمان کا ادنیٰ کرشمہ قرار دے کر داد کا رخ بے تکلف احمد خضر کی طرف کیجئے، ناپسندیدہ ہے تو گردن زدنی میں ہوں'' (لالہ وگل ص ۱۴)۔

شاہ جی کی حالات حاضرہ پر گہری نگاہ رہتی وہ مسلمانوں پر دشمنان اسلام کے تابڑتوڑ دینی علمی مذہبی فکری اور عسکری حملوں سے نہ صرف کڑھتے بلکہ تاریخ اسلام اور صحابہ کرام کے عہد میمون سے وافی شافی اس کا تحلیل وتجزیہ فرماتے ہیں، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں ''اس صدی کا مسلمان مشرق میں ہو یا مغرب میں جنوب میں یا شمال میں زندگی کے جن نازک مرحلوں سے گذر رہا ہے اس طرح کہ شوکت وطاقت سے بھی محروم ہے اقتصادی ومعاشی الجھنوں میں بھی گرفتار اور سیاسی اقتدار سے بھی بہت دور، ان حالات میں اسلام کی ان چند شخصیتوں کے عبرت انگیز حالات اور کوائف ہی سننے اور سنائے جانے کی چیز ہے۔ کیا عجب ہے کہ امت کی موجودہ نسل اپنے رجال واشخاص کی زندگی کو نمونہ بنا کر روشنی کے ان مناروں سے اپنے ٹمٹماتے ہوئے چراغ روشن کر سکے''۔

آپ کا قلم وزبان اسلام کا ترجمان تھا وہ دفاع عن الدین کے بارے میں بیحد حساس

تھے۔ مغرب کی جانب سے جو تمدنی اور فکری یورشیں مشرقی ایوانوں پر ہو رہی تھیں اس سے آپ رنج والم محسوس کرتے اور اس پر قدغن لگانے سے دریغ نہ فرماتے، چنانچہ آگے تحریر فرماتے ہیں:

''امریکہ کی تقلید، یورپ کا فکر، کمیونزم کے تخیلات، امپریلزم کے افکار اور سوشل نظریات وغیرہ ذلتوں کے گڈھوں میں کھینچ کر لیجانے والے تو ہیں لیکن قعر مذلت سے نکلنے اور نکالنے کا کام ان سے نہیں لیا جا سکتا، خاک نشینوں کو خاک سے کاخ تک پہنچانے کا ذریعہ وہ تعلیمات ہیں جن کا سرچشمہ قرآن وحدیث میں اور جس کے سوتے عمل بالقرآن اور عمل بالسنۃ سے نکلتے ہیں، آج بھی انہیں حقائق پر عمل کرنے والے یہ کہتے ہوئے منزل کی طرف بڑی تیز گامی سے چلے جارہے ہیں کہ ''ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا'' (لالہ وگل ص ۱۶)۔

شاہ صاحب کی تحریروں کے کئی زاویے ہوتے ہیں جو سب کے سب مکمل اور قابل رشک، جہاں ان کا صوتی رنگ وآہنگ غضب کا ہوتا ہے وہیں ان کا پیرایہ بیان بھی دلچسپ، وہ الفاظ بھی خوب لاتے ہیں مگر معنویت کا حقیقی رشتہ بھی ختم ہونے نہیں دیتے، جس کا اندازہ ذیل کے اس اقتباس سے لگایئے جو صاحب ترجمان السنہ حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی پر ہے:

''نیرنگی ہائے قدرت کہ نوح کے یہاں کنعان آزر کے یہاں ابراہیم وجود پذیر ہوئے اور عجیب وغریب روایات بطور یادگار وسرمایۂ عبرت اپنے پیچھے چھوڑیں مشور ہندی شاعر ''اقبال'' کو فخر تھا اور اسی فخر نے ان سے کہلایا ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی   برہمن زادۂ ورمز آشنائے روم وتبریز است

اس میں یہ اور اضافہ کر لیجئے، کہ پورا گھرانہ مغربی تعلیم سے آراستہ، کوئی کلکٹر، کوئی ڈپٹی کلکٹر، کوئی تھانیدار لیکن مخرج الحی من المیت نے انہیں ''اموات'' میں ایک جیتی جاگتی ہستی بھی پیدا کر دی۔ دنیا سے چلے اور دین تک جا پہنچے، فرنگیت کے غبار سے دامن

جھاڑا اور پھر زمزم سے ہمیشہ کیلئے اسے دھوڈالا اور ایسا نچوڑا کہ فرنگیت کے آثار باقی نہ رہے۔ زہدوتقویٰ کی دھوپ میں اسے سکھایا، جسم زیبا پر لیا تو اس کی زیبائی میں اور اضافہ ہوا، سرخ وسپید چہرہ، منور آنکھیں، اس پر تابدار چشمہ، سر پر بالعموم رومال، نزاکت میں تانا شاہ، نفاست میں واجد علی، حدت مزاج ایسی کہ ڈگری کبھی کم نہ ہوتی۔ (لالہ وگل ص ۱۳۴)

خانوادۂ قاسمی کے روشن چراغ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا تعارف بالکل ان کے مناسب حال یوں کراتے ہیں:

''خانوادۂ قاسمی کے گوہر شب چراغ، چمنستان قاسمی کے گل سبد، سحرالبیان مقرر وواعظ، ہزار داستان نکتہ آفریں، نکتہ شناس، پرانی روایات کے حامل لیکن جدت سے بھی نفور نہیں بلکہ قدیم وجدید کے سنگم، ایسے دریا جس میں ہر طرح کی ندیاں آکر گھل مل جائیں، خوش رو بلکہ مغل شاہزادوں کی طرح خوب رو خوش پوشاک، قامت ایسا زیبا کہ ہر لباس ان کے بدن پر بہار دیتا، روئی کے گالے کی طرح سفید بڑی آنکھیں جن پر دبیز پلکوں نے خوشنما سائبان کی شکل اختیار کی تھی، چہرہ پر معصومیت کا نور، خلوت اور جلوت میں فرشتوں کے ہجوم میں رہتے، جس مجلس میں پہنچتے صدر نشیں، جس محفل میں در آتے تو مسند آرا، حلم وتحمل، صبر وضبط پوری زندگی پر حاوی، عفو ودرگزر زندگی کے ہر شعبہ ومنزل میں نمایاں، ساٹھ سال سے زائد دارالعلوم کا اہتمام کیا اور اسے جہاں گیر بنایا، شرق وغرب کے سفر کئے اور دارالعلوم کی آفاقیت کے پھریرے اڑائے۔ (ص ۱۲۸)

شاہ صاحبؒ ملفوظات حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے بہترین حافظ اور ناقل ہیں کوئی بھی مسئلہ ہو یا کوئی بھی ادق موضوع ان کا ثاقب ذہن فوراً اس کے مالہ وماعلیہ کی تفہیم وتحصیل میں اپنا جوہر کمال دکھاتا ہے یہاں صرف نقلِ ملفوظ کا نمونہ دیکھئے!

''اہل علم جانتے ہیں کہ الجھے ہوئے مسائل میں امام ابوحنیفہؒ آخری فیصلہ مبتلی بہ پر چھوڑ دیتے ہیں اور پھر حضرت تھانوی تو بلاشبہ فقیہ الامت تھے جن کے فتاویٰ پر آج بھی کروڑوں مسلمان باطمینان خاطر حرام وحلال، جائز وناجائز کے فیصلے قبول کر رہے ہیں مگر آپ ہی کو اک روز نماز کے ختم پر دانتوں میں کچھ خون کا شبہ ہوا تو نماز کی صحت وعدم صحت کے بارے میں اپنی رائے پر اعتماد کے بجائے دو مستند اہل فتویٰ کو دکھا کر نماز کی صحت کا اطمینان حاصل کیا، ان علمائے ربانیین کی یہی شان تھی .... دانت کی تکلیف کے دوران لاہور کے کسی معالج نے دانت میں سونے کے استعمال کی تجویز کی، حضرت کو اس میں کچھ الجھن تھی تو باضابطہ دارالعلوم کے دارالافتاء سے استفتا فرمایا اس وقت کے مسند نشین اہتمام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب وحضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے تھانہ بھون حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ خود فقیہ الامت ہیں آپ کے ہوتے ہوئے ہم اس پر کیا لکھیں فرمایا کہ ''یہ میری ذاتی الجھن ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنے لئے سہولت کی راہ نکال لوں'' اگر مقالے کی طوالت کا خوف نہ ہوتا تو اس طرح کے احتیاط کے واقعات آپ کی سوانح سے بکثرت پیش کئے جاسکتے ہیں۔ (ص ۴۹)

زیر قلم شخصیت پر جب آپ خامہ فرسائی کرتے ہیں تو حقیقت نگاری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا، تعارف بھی تعریف بھی اور تنقیح بھی، مگر سوال نہیں کہ منفی تنقید کا کوئی بھی عنصر درآیا ہو دیکھئے یہ نمونہ:

''قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے پوتے، دارالعلوم دیوبند کے فاضل، حاذق طبیب اور گوشہ نشین دانشور، لباس وپوشاک نفیس، گفتگو نستعلیق، ان کی اردو عرب کے صحرا سے اس طرح گذری کہ اردو برائے نام اور عربی کا غلبۂ تمام، حافظہ بے نظیر، مضامین مستحضر، بولنے پر آتے تو بے تکان بولتے چلے جاتے، ناز میں پلے ہوئے، نیاز

مندی سے بہت دور، مرزا مظہر جان جاناںؒ نے لکھا ہے کہ نازک مزاجی لازم صاحبزادہ گیست'' مرزا مرحوم کے اس قول کی تصدیق حکیم صاحب کو دیکھ کر کرنا پڑتی ہے، مشہور مقولہ ہے کہ بیوی اور خادم کسی کے معتقد نہیں ہوتے، خاکسار کی جانب سے اس میں صاحبزادوں کا بھی اضافہ کر لینا چاہئے لیکن عجیب بات ہے کہ حکیم صاحب کو حضرت شاہ صاحب مرحوم سے بے پناہ عقیدت تھی خاکسار سے فرمایا کہ میں جب دارالعلوم دیوبند میں پڑھتا تھا تو حضرت شاہ صاحبؒ کو ارادتاً پہروں دیکھتا اور یہ سوچتا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفتار و گفتار آپ کی نشست و برخاست، قعود و قیام، لباس و پوشاک، انداز کلام و گفتگو اس طرح ہوگا۔ (ص ۲۲۵)

اپنے وطن کشمیر کا تعارف جس طرح شاہ صاحب نے لکھا ہے وہ انہی کا کمال اور حصہ ہے، کشمیر کے تعارف پر یہ ایک البیلی تحریر ہے جو بس پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے، پر شوکت الفاظ ہیں، موثر و دلکش تعبیرات ہیں، سوز دروں اس پر مزید چنانچہ لکھتے ہیں:

'' حضرت شاہ صاحب مرحوم کا وطن وہی کشمیر ہے جو اپنے حسن و جمال، رعنائی وکشش، جاذبیت و دلکشی شادابی و شادابی میں عالمی شہرت رکھتا ہے جس کی پر حسن فضا، دوڑتے ہوئے دریا، اچھلتا ہوا پانی، چشموں کی فراوانی، نکہت گل کی کثرت، پھلوں کی بہتات، آب و ہوا کی خوش گواری، مناظر کا حسن قدیم زمانے سے سیاحوں کے دامن دل کو اپنی جانب کھینچتا رہا، بادشاہوں نے یہاں پر بار عیش کھولا اور خانقاہ بدوش صوفیاء اس کے جمال دل افروز میں پا گرفتہ''۔ (ص ۳۶۷)

حضرت شاہ صاحب اپنے والد مرحوم کی شاعری اور ان کی فن کارانہ صلاحیتوں کے اعتراف میں لکھتے ہیں:

''مبدأ فیاض شاعر کو ایک نرم و نازک و حساس قلب سے سرفراز فرماتا ہے۔ وہ

اپنے ماحول وگردوپیش سے عام انسان سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوتا ہے اور پھر اس کا تاثر شعری لب ولہجہ میں ڈھل کر دوسروں کیلئے اثر انگیز واثر آفریں ہوتا ہے۔ محبوب کی بے التفاتی، رقیبوں کی عداوت، پھولوں کا حسن، نسیم سحر کی نزاکت، کہساروں کی رفعت، پانی کی اچھل کود یہ اور سب چیزیں شاعر پر ایک اثر چھوڑتی ہیں، اسی طرح وہ کسی کی موت کی شدت کو بھی محسوس کرتا ہے، یہی اثر مرثیہ بن جائے گا اسے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی سے والہانہ تعلق نعت کی طرف متوجہ کرے گا، خدائے تعالیٰ کی صناعی اور اس کے انعامات کی بارش حمد کا روپ دھارے گی، کسی شخص کے کارنامے دامن دل کو کھینچیں گے تو وہی قصیدہ بن جائے گا، غرضیکہ غزل ہو یا نظم، مسدس ہو یا رباعی، قطعات ہوں یا مخمس ہر ایک کا پس منظر شاعر کو اپنے تاثرات وانفعالات کے اظہار پر مجبور کر دیتا ہے۔۔۔حضرت شاہ صاحب ہوں یا علمائے ربانی ان کے قصیدے کرم طرازیوں یا امراء کی عنایتوں کا مظہر نہیں ہوں گے یہ کام تو قاآنی وخاقانی کا ہے" (نقش دوام ۲۶۲ / ۲۶۳)

ختام مسک کے طور پر بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحب شگفتہ تحریر وانشاء کے طرح دار تھے۔ نقش دوام کا ہر ورق اور اس کی ہر سطر علم وکمال کے خزانہ سے مملو ہے، وہ اپنی تحریر کے بانکپن میں عظمتوں کا طواف کرتے نظر آتے ہیں، لالہ وگل ہو یا نقش دوام ایک مرتبہ شروع کر دیجئے بس پھر مطالعہ کا انہماک بڑھتا ہی جاتا ہے، قاری کے سامنے ان کی نثری ادائیں اس طرح رقص کناں ہوتی ہیں کہ وہ بھی ان کی زلفوں کا اسیر ہو کر مچلنے لگتا ہے، اس کیلئے بسا اوقات یہ فیصلہ بھی کار دشوار ہوتا ہے کہ وہ واقعات کو مستحضر کرے یا شاہ صاحب کے اسلوب نگارش کو اپنے خانۂ دل میں آباد کرے، آخر کونسا موضوع ہوگا جس پر شاہ صاحب نے اپنے تیز گام قلم کو حرکت نہ دی ہو ان کی خدماتِ علم وقلم کا ایک وسیع جہان

آباد ہے، جہاں شاہ صاحب اپنی ساحرانہ صحافت اور دل ربا نثری شناخت کے ساتھ تادیر زندہ رہیں گے اور ان کے معارف و مآثر کی شام دیر اور بہت دیر سے آئے گی۔

(بہ شکریہ ماہنامہ محدث عصر دیوبند)

ترجمانِ حق اور سلف کی مثالی یادگار

حضرت مولانا مفتی عبدالقدوس رومیؒ

علم وادب، فکر و تحقیق، شعر و سخن اور فقہ و فتاوی کے باب میں خوش گوار اور قابل قدر اضافہ کرنے والے ترجمان حق حضرت مولانا مفتی عبدالقدوس رومی علیہ الرحمہ بھی آخرت کو سدھار گئے انا للہ وانا الیہ راجعون، ان کے سانحہ ارتحال سے علمی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی اور ان کے حادثۂ وفات کو ناقابل تلافی نقصان قرار دیا گیا، بالخصوص اسلئے بھی کہ وہ سلف کی آخری نشانی اور دارالعلوم ومظاہر علوم کی علمی و تحقیقی روایتوں کے نقیب تھے، ہندو پاک کے نابغۂ روزگار اہل حق علماء میں وہ امتیازی شان رکھتے تھے اور دین ودانش کے باب میں کسی مداہنت یا مجاملت کے روادار قطعاً نہ تھے، کئی آزمائشی مرحلے آئے جب اچھے بھی خاموش یا مصلحت کے اسیر نظر آئے، لیکن حضرت مفتی صاحب کو اللہ رب العزت نے حق گوئی و بے باکی کا خوب خوب ملکہ عطا کیا تھا، اس لئے وہ کہیں بھی رجعت قہقری کے شکار نہیں ہوئے، صاف گوئی میں وہ اہل حرم کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے اور جس موقف پر ڈٹ جاتے ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے، اس کے لئے انہیں کسی بھی

قربانی سے دریغ نہیں تھا ان میں ایسی ہی خوبیاں مبدا فیض سے ودیعت کی گئی تھیں جو انہیں دیگر معاصرین سے ممتاز کر دیتی ہیں وہ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور دونوں اداروں کے فیض یافتہ تھے اور وہاں کے روشن ضمیر اور فرشتہ صفت اساتذہ کبار کے نورِ نظر بن کر کندن ہو گئے تھے، اپنے اساتذہ و مشائخ کا انہیں اعتماد حاصل تھا وہ اشرف الفکر تھے اور اشرفی ذہن رکھتے تھے، حکیم الامت زاہد مرتاض حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کے مآثر علمیہ سے انہوں نے بطور خاص کسبِ فیض کیا تھا، خود ایک جگہ ارقام فرماتے ہیں:

"خدا جانے کتنی بار تھانہ بھون اور سہارنپور میں بھی اور لکھنؤ میں بھی حضرت نور اللہ مرقدہ کی زیارت کی، ملفوظات سنے اور اصلاحی مکاتبت سے بھی استفادہ کا موقع ملا فللہ الحمد ولہ الشکر"۔

حضرت مفتی عبدالقدوس رومیؒ ۲/شوال المکرم ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹/مئی ۱۹۲۳ء بروز شنبہ کو عالم نبیل حضرت مولانا سراج الحق مچھلی شہری کے یہاں الٰہ آباد میں پیدا ہوئے، انہی کی زبانی سنئے:

کتنا تعارف ہو کسی کا ظاہری تصویر سے
کوئی اندازہ صحیح اس سے لگا پاتا نہیں
مچھلی شہر اصلی وطن مولد الٰہ آباد ہے
آگرہ میں آگرا ہوں دل یہیں اب شاد ہے

مفتی عبدالقدوس رومی علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، ان کے آباء و اجداد نسلاً بعد نسلٍ شریعت و طریقت اور علم و تحقیق کی مجلسوں کو آراستہ کئے ہوئے تھے اور وہاں علم و فضل، تقویٰ و طہارت، خشیت، انابت الی اللہ کا طوطی بولتا تھا، آپ کی ذہنی نشو و نما اور

تعلیمی واخلاقی تربیت بھی خالص دینی منہاج پر پروان چڑھی تھی، ان کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں والدین کے علاوہ پاکیزہ صفت اور اہل دل اساتذہ کرام کا مرکزی کردار رہا ہے اور وہ حضرات بلا ریب اپنے وقت کے شبلی وجنید تھے ؎

اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

مفتی صاحب علیہ الرحمہ ادھر چالیس برسوں سے سرزمین آگرہ میں علم وتحقیق کی شمع روشن کئے ہوئے تھے اور منصب افتاء وقضاء کو رونق بخش رہے تھے، اس سے قبل وہ ڈابھیل وغیرہ میں درس وتدریس کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے تھے۔

یہاں آگرہ جیسے جہالت وبدعت کے گڑھ میں انہوں نے علوم ومواعظ اور خطبات ونصائح کی روشنی بکھیری، جس کے نتیجے میں صالح اسلامی معاشرہ کی قدریں پروان چڑھیں، آج اگر وہاں ایمانی باد بہاری کے کچھ جھونکے محسوس ہوتے ہیں اور دین ودانش کے غلغلے ہیں، بلاشبہ ان کے پیچھے مفتی صاحب کی شبانہ روز کی قابل رشک قربانیوں کا بڑا دخل ہے۔

مفتی صاحبؒ نے بھی اصناف میں طبع آزمائی کی، اللہ نے انہیں زبان وقلم کی دولت سے مالا مال کیا تھا، ان کا ذہن فکر رساں اور قلم شاداب تھا، وہ شگفتہ لکھنوی اور دہلوی زبان میں لکھتے اور کہتے تھے، ان کے سیال قلم سے تفسیر وحدیث، فقہ وفتاویٰ، ترجمہ وتشریح اور تسہیل وترتیب کا گنجہائے گرانمایہ تیار ہوا، ان کی بعض علمی وتحقیقی کتابوں نے تو علمی حلقوں میں دھوم مچادی تھی اور اہل علم وتحقیق کو عش عش کرنے پر مجبور کردیا تھا "دیوبند سے بریلی تک" "الیس منکم رجل رشید" جیسی وقیع کتابیں انہوں نے بطور یادگار چھوڑی ہیں۔

مولانا رومیؒ بالغ نظر عالم دین، کہنہ مشق، صاحب قلم، شگفتہ نثر نگار اور نابغۂ روزگار شاعر وسخن ور تھے، وہ قلم برداشتہ لکھتے اور کہتے تھے، مظاہر علوم میں ان کے سب سے بڑے

محسن حضرت مولانا الشاہ محمد اسعد اللہ رامپوری سابق ناظم اعلیٰ نے اپنے ایک منظوم مکتوب میں لکھا:

میرے محترم مولوی رومی　　　آپ دیکھیں نہ چہرۂ شومی

مولانا رومیؒ نے اس کا جواب نظم میں ہی دیا ہے

بفیض حضرت اسعد ہے یہ سخن گوئی　　　وگرنہ رومی ہے کیا اس کی گفتگو کیا ہے

ان کی شاعری کی ابتدا خود انہی کی زبانی سنئے، فرماتے ہیں:

''احقر کی شاعری کی ابتداء مظاہر علوم کی طالب علمی کے زمانہ میں ہوگئی تھی، جس کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت مولانا دوپہر میں اپنے صاحبزادے مولوی محمد اللہ مرحوم کو شرح ماۃ عامل پڑھایا کرتے تھے، ایک روز احقر بھی جا بیٹھا اور سبق کے دوران جو صورت حال پیش آئی اس کو نظم کر دیا...... یہ میری سب سے پہلی فی البدیہہ نظم تھی، ظہر کے بعد حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کی، پڑھ کر مسکرائے اور محظوظ ہوتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تمہاری طبیعت کو نظم سے مناسبت معلوم ہوتی ہے، اگر تم شاعری نہ کرو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے''۔

شعر و ادب میں مولانا رومیؒ کی بے شمار نظمیں، غزلیں، قصیدے، مرثیے، تہنیت نامے، لطیفے اور فقرے ان کے عمدہ اور نفیس شعری ذوق پر شاہد عدل ہیں۔

حضرت مفتی صاحب بے شمار اوصاف و کمالات کے مالک تھے، ظاہری چمک دمک اور دنیوی ٹیپ ٹاپ سے قطعاً متاثر نہ ہوتے تھے، حالانکہ جس منصب پر وہ براجمان تھے اگر چاہتے تو حکومت و امراء سے بہت سی مراعات حاصل کر لیتے، لیکن اہل حکومت اور ارباب سیاست و تمول سے دوری ان کا شیوہ رہا: ع

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ　　　ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

حضرت مفتی صاحب کو حکمرانوں کی قربت، صحبت چندروزہ شان وشوکت اور نام ونمود سے کوئی سروکار نہ تھا، بلکہ ان چیزوں کو وہ اپنی دینی مصروفیات کے لئے رکاوٹ سمجھتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنی پوری زندگی کو ان آلائشوں سے پاک رکھا اور اپنی حیات مبارکہ کو جناب نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد "نعم الرجل الفقیہ ان احتیج الیہ نفع وان استغنی عنہ اغنی نفسہ" (بہترین آدمی فقیہ ہوتا ہے، اگر اس کے پاس حاجت لے کر جائیں تو نفع پہنچائے، اگر اس سے کنارہ کرلیں تو وہ بھی بے پرواہ رہے) کے مفہوم کے مطابق گزارنے کی سعی مشکور کی۔

مفتی عبدالقدوس رومیؒ زمانہ شناس اور نباض وقت تھے، ان کا ذہن وراکی وبراقی تھا، اپنے گردوپیش سے بخوبی واقف تھے، ایک زمانہ میں جب حکومت نے وندے ماترم جیسے مشرکانہ ترانے کے پڑھنے کو مسلم بچوں کیلئے بھی لازمی قرار دینے کی سازش رچی اور مشرکانہ مضامین کا نصاب تعلیم میں در آنے کا راستہ ہموار کرنے کی کوشش کی تو مفتی صاحب تاڑ گئے اور پوری حکمت وبصیرت کے ساتھ اس نظریاتی عقیدہ کا تعاقب کیا اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے فرمایا کہ آپ تمام مسلمانوں سے اپیل کریں کہ وہ اپنے بچوں کو ایسے اسکولوں سے ہٹالیں جہاں ایسا نصاب پڑھایا جاتا ہو اور صاف صاف کہہ دیں کہ ہم یہ نصاب نہیں پڑھائیں گے، چنانچہ مولانا ندویؒ کا اعلان کرنا تھا کہ حکومت دہل گئی اور فوراً اپنے ایجنڈہ کو واپس لے لیا، رجیل موصوف کی زندگی کے کن کن گوشوں پر خامہ فرسائی کی جائے، وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، شمع علم کے پروانے ان کے ارد گرد دیوانہ وار رہتے تھے، آگرہ جیسے وادئ غیر ذی زرع کو انہوں نے زرخیز بنادیا تھا، اصحاب فکر ونظر جب ان کی علمی شخصیت کو اپنی تحقیق کا موضوع بنائیں گے تو ان کی علمی

زندگی کے بہت سے روشن پہلو سامنے آئیں گے کہ کس طرح انہوں نے دیوبندیت کے وقار واعتبار کا تحفظ کیا اور اس کی ترجمانی کا فریضہ ادا کیا، فجزاہ اللہ فی الآخرہ۔

حضرت مفتی صاحبؒ اپنے وقت موعود پر اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے، دین وادب کی مجلسیں ان کی موجودگی سے چکاچوند ہوجایا کرتی تھیں: ع

چراغ لاکھ ہیں لیکن کسی کے اٹھتے ہی — برائے نام بھی محفل میں روشنی نہ رہی

کاتب الحروف نے چند سال پیشتر شہر آگرہ کے ایک بڑے اصلاحی اجلاس میں ان کی زیارت کی تھی اور حسن اتفاق کہ سال رواں میں ان کے جانشین محترم حضرت مولانا مفتی مجدالقدوس خبیب رومی مدظلہ صدر مفتی دارالافتاء مظاہر علوم سے استفادہ کا موقع میسر آگیا اور اس طرح یہ ناچیز بھی حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کے بالواسطہ خوشہ چینوں کی فہرست میں آگیا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

(بہ شکریہ ترجمان دیوبند نومبر، دسمبر ۲۰۰۹ء)

دارالعلوم دیوبند کے سابق شیخ الحدیث

استاذ الاساتذہ حضرت مولانا نصیر احمد خاںؒ

۴ فروری ۲۰۱۰ء بروز جمعرات کو کاتب الحروف حسب معمول جیسے ہی نیند سے بیدا رہوا اور نماز وغیرہ کی تیاری میں لگا ہی تھا کہ اچانک موبائل کی گھنٹی بجی ریسیو کیا تو دوسری طرف سے برادرم مولانا محمد طیب قاسمی شریک افتاء دارالعلوم دیوبند (حال استاذِ حدیث بدرالعلوم گڈھی دولت) نے انتہائی مغموم لہجہ میں خبر دی کہ استاذ محترم حضرت مولانا نصیر احمد خان سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند طویل علالت کے بعد رحلت فرما گئے، بے ساختہ زبان پر استرجاع کے کلمات جاری ہو گئے اور ان کی فرشتہ صفت شخصیت کی جو یادیں اور باتیں ذہن کے نہا خانوں میں رچ بس گئیں تھی مزید گہری ہوگئیں، اس لئے بھی کہ دارالعلوم دیوبند کے دس سالہ قیام میں راقم جن عبقری شخصیات سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا اور جن کے علم وعمل کے روشن چراغوں سے ذہن وافکار کی تاریکی کے پرہول سناٹے کافور ہوئے ان میں استاذ اکبر حضرت مولانا نصیر احمد خان بھی تھے، گو ان کی پیرانہ سالی اور علالت کے سبب ان سے بخاری شریف کے اسباق محض چند ماہ تک ہی پڑھنے کی سعادت حصہ میں آئی لیکن اس درمیان جو کچھ ان سے پڑھا اور سنا وہ ان کی یادوں کی محفل سجانے کیلئے کافی ہے۔

اللہ رب العزت نے انہیں بے شمار خصائل حمیدہ سے آراستہ کیا تھا، ان کے چہرے پر معصومیت کا غازہ ہوا کرتا تھا، شیریں گفتار، خوش فکر، خوش اخلاق اور دلنواز، نشست وبرخواست باوقار، لب ولہجہ میں سنجیدگی وٹھہراؤ، طلبہ ومتعلقین کے ساتھ محبت وشفقت، ان کے ساتھ ہمدردانہ جذبات اور خود نہایت پاکیزہ وپاکباز، دنیوی ہنگاموں اور احتجاجات سے دور، صرف لکھنا پڑھنا ہی ان کا محبوب مشغلہ تھا، اپنا پورا وقت تدریس

ومطالعہ ذکر وفکر اور عبادت ہی میں گزارتے تھے، دارالعلوم دیوبند کے قضیۂ نامرضیہ کے موقع پر بھی وہ الگ تھلگ رہے اور اپنے مفوضہ تدریسی فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔

آپ کی پیدائش ۲۱ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۳ دسمبر ۱۹۱۸ء کو ضلع بلند شہر یوپی کے بسی گاؤں میں ہوئی، تعلیم کے تمام مراحل مدرسہ منبع العلوم گلاوٹھی میں طے کئے، مزید استفادہ کیلئے ازہر ہند دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور ۱۳۶۲ھ میں دوبارہ دورۂ حدیث شریف پڑھا، آپ کے اساتذہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی مولانا بشیر احمد خان اور حضرت مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک جیسے مشاہیر سرفہرست ہیں، دارلعلوم دیوبند میں آپنے تقریباً ۶۵ رسال درس دیا جن میں ۳۲ رسال صرف بخاری شریف کی تدریس کے ہیں، دریں اثناء دارالعلوم میں آپنے متعدد مناصب کو زینت بخشی دارالعلوم کے صدرالمدرسین وکارگزار مہتمم ہونے کے علاوہ ایک عرصے تک دارالاقامہ کے نگراں بھی رہے، طلبہ میں آپ بے حد مقبول تھے، آپ کا انداز درس بہت خوبصورت تھا، یہی وجہ تھی کہ تمام طلباء پابندی کے ساتھ آپ کے متعلقہ گھنٹہ میں شروع سے اخیر تک شریک رہ کر اپنا اپنا دامن مراد بھرتے، حضرت مولانا عبارت پڑھوانے کے بعد روایت پر کلام کرتے اور نہایت جامعہ انداز میں اسپر روشنی ڈالتے، تراجم الابواب پر ان کی مربوط تشریحی گفتگو دلشاد کر دیتی تھی، علوم عقلیہ ونقلیہ پر انہیں یکساں قدرت تھی، علم ہیئت کی پرخار وادیوں کے تو وہ سیاح اکبر تھے اپنے بعض دیگر بزرگوں سے سنا کہ علم ہیئت پر حضرت شیخ اول کی نظر گہری ہے اور اس راہ کے وہ تن تنہا مسافر ہیں۔

حضرت مولانا کی کن کن خوبیوں اور خصوصیتوں کا تذکرہ کیا جائے، وہ علم وادب کے روشن چراغ تھے اس دور قحط الرجال میں ان کا سایہ بسا غنیمت تھا انہوں نے دارالعلوم کے خیر القرون کے محدثین واساتذہ کرام کا جلوۂ جہاں آرا دیکھا تھا جن کی گوناگوں صفات وامتیازات کے وہ حسین سنگم تھے اور ان کی روشن روایتوں کا انہوں نے نہ صرف تحفظ کیا بلکہ

دیانت وامانت کے ساتھ انہیں آگے بڑھایا اور نسل نو میں انہیں منتقل کرنے کی سعی مشکور کی، ان کی محبتیں اور شفقتیں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی، افسوس کہ دنیا بہت تیزی کے ساتھ ایسے لوگوں سے خالی ہورہی ہے، جن چراغوں کی لو قیامت تھی وہ اب گل ہوتے جارہے ہیں تاریکی اپنے پاؤں پسار رہی ہے، حضرت مولانا نصیر احمد خان کا سانحہ ارتحال علمی برادری کا ناقابل تلافی نقصان ہے جس کی بھرپائی بظاہر دشوار نظر آرہی ہے، آج کے اس ناگفتہ بہ دور میں ان جیسے مصلحین ومربیین اور باتوفیق مدرسین کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔

وماکان قیس هلکه هلک واحد ولکنه بنیان قوم تهد ما

کاتب الحروف نے ان کے طلباء کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کا بارہا مشاہدہ وتجربہ کیا، طلباء کے مسائل کے حل میں وہ خصوصی دلچسپی لیا کرتے تھے اور سب کے کام آیا کرتے تھے، ایام طالب علمی میں اگر طلباء ماہنامہ دارالعلوم یا کسی اور رسالے میں مضمون لکھتے تو مولانا بہت خوش ہوتے تھے بلکہ بعض دفعہ بلا کر ہمت افزائی بھی کیا کرتے اور مزید کچھ کرنے کی ترغیب وتلقین فرماتے، سال گذشتہ سے پیوستہ سال جب راقم دورۂ حدیث شریف کا متعلم تھا تو حسب سابق سال کے اختتام پر رفقاء دورۂ حدیث نے ''نصیر کارواں'' کے نام سے ایک ڈائری نکالنے کا پختہ ارادہ کیا چنانچہ ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، برادرم مولانا عبدالرحمن اجمل قاسمی ابن حضرت مولانا بدرالدین اجمل (رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند وممبر پارلیمنٹ) اور دوسرے بعض ارکان نے ڈائری کے مشمولات ومضامین کی ذمےداری احقر کے سپرد کی، باتفاق رائے طے ہوا کہ امسال حضرات اساتذہ کرام کے پیغامات بھی شامل اشاعت کئے جائیں چنانچہ، حضرت شیخ اول سے بھی پیغام لکھنے کی درخواست کی فرمانے لگے مولوی صاحب! تم ہی لکھ لو ضرورت پڑی اصلاح کردوں گا احقر نے اس موقع پر جو لکھا تھا وہ درج ذیل ہے۔

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، اما بعد!

عزیزان گرامی قدر! آپ حضرات خوش قسمت اور قابل مبارکباد ہیں کہ آپ نے

علم وعمل کی مثالی درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کے ایک مرحلہ کی تکمیل کی ہے اوراب ایک نئے مرحلہ میں آپ داخل ہورہے ہیں اللہ رب العزت قدم بقدم آپ کی حمایت ونصرت فرمائے اور جملہ شرور وفتن سے محفوظ رکھے، آمین۔

عزیزان گرامی! میری نصیحت اس وقت یہی ہے کہ آپ کی زندگی کا مقصد علم دین کی تبلیغ واشاعت اوراس کا تحفظ ہونا چاہئے، دین وشریعت کی مکمل پیروی آپ کا نصب العین ہواور یاد رکھئے اس وقت اسلام عالمی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے، مخالفین اس کی پاکیزہ تعلیمات اورنام لیواؤں کو ہدف تنقید بنارہے ہیں، ایسے ناگفتہ بہ احوال میں آپ کی ذمے داریاں مضاعف ہوجاتی ہیں کہ اسلام کوانسانیت کی ناگزیر ضرورت اورنجات دہندہ مذہب ثابت کردکھائیں، اللہ ہم سبھوں کے ساتھ خیر کثیر کا معاملہ فرمائیں آمین، بندہ بھی آپ کی نیک تمناؤں اوردعاء کا طالب ہے، والسلام۔

(حضرت مولانا) نصیر احمد (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند)

حضرت مولانا نے جونہی یہ پیغام ملاحظہ فرمایا تو بہت خوشی کا اظہار کیا اس پر دستخط کئے اوردیر تک دعائیں دیتے رہے، آج جب کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے ان کی وہ عنایات آنکھوں کواشک بار کررہی ہیں، مضمون کے شروع میں بھی ذکر کیا کہ ان کے سانحۂ رحلت کی اطلاع اسی روز علی الصباح مل گئی تھی فوراً جامعہ اشرف العلوم رشیدی کے میر کارواں حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ صاحب مدظلہم کو باخبر کیا گیا، حضرت نے مسجد زکریا میں ان کیلئے ختم کراکے ایصال ثواب کرایا، ضروری اسباق پڑھا کر حضرت ناظم صاحب اوربعض اساتذہ جنازہ میں شرکت کیلئے دیوبند روانہ ہوگئے، بعد نماز ظہر ان کی نماز جنازہ حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب منصور پوری نے ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں پڑھائی، بعد ازاں مزار قاسمی میں وہ آسودہ خاک ہوئے ؏

آسماں ان کی لحد پہ شبنم افشانی کرے

(یہ مضمون ماہنامہ صدائے حق بابتہ ماہ اپریل ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا)

تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے رہنما

حضرت مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانویؒ

۲۴ر ستمبر ۲۰۱۰ء بروز جمعہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے کارگذار صدر اور مشہور عالمِ دین حضرت مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانویؒ اپنی حیات مستعار کی ۷۲ر بہاریں دیکھ کر آغوش رحمت میں جا بسے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا کیرانویؒ عربی واردو اور انگریزی کے مایہ ناز اسلامی اسکالر تھے، وہ وحید العصر ادیب زماں حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی کے برادرِ حقیقی تھے، دارالعلوم دیوبند میں اساتذہ کبار کے سامنے انہوں نے زانوئے تلمذ طے کیا تھا اور فراغت کے بعد دارالسلطنت دہلی کو اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز بنایا، ایک عرصہ تک جمعیۃ علماء ہند سے بھی وابستہ رہے، سعودی سفارت خانہ میں تقریباً ۲۶ر سال تک آپنے بطور اسسٹنٹ کام کیا، مولانا کیرانوی فعال، متحرک اور سرگرم شخص تھے، انہوں نے مختلف پلیٹ فارموں سے دینی وملی اور اصلاحی وسماجی خدمات انجام دیں، اپنے مربی اور برادر بزرگوار حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی کے بہت سے کاموں کو آگے بڑھایا، مولانا گوناگوں اوصاف وکمالات کے آدمی تھے، تواضع، حسنِ اخلاق، مروت اور دلنوازی آپ کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

مولانا انتقال کے وقت اپنے گھر ذاکرنگر اوکھلا دہلی میں صاحبِ فراش تھے، بعد ازاں ان کا جسد خاکی دیوبند لایا گیا، جہاں احاطۂ مولسری میں نماز جنازہ ان کے رفیق

درس اور جمعیت علماء ہند کے قومی صدر حضرت مولانا سید ارشد مدنی نے پڑھائی، تدفین مزار قاسمی میں عمل میں آئی۔ (یہ مضمون ماہنامہ صدائے حق ماہ ستمبر، اکتوبر ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا)

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب بجنوریؒ

یکم محرم الحرام ۱۴۳۲ھ مطابق ۸ ردسمبر ۲۰۱۰ء بروز بدھ کو یہ کاتب الحروف اپنے متعلقہ اسباق پڑھانے کے بعد ماہنامہ ''صدائے حق'' کے دفتر میں بیٹھا ہوا تازہ شمارہ کی ایڈیٹنگ میں مشغول تھا کہ اچانک موبائل کی گھنٹی بجی فون ریسیو کیا تو دیوبند سے برادرم مولوی شاہنواز بدر نے مغموم لہجہ میں یہ دلخراش خبر سنائی کہ حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اپنے آبائی وطن بجنور میں اس جہاں فانی سے رحلت فرما گئے، راقم آثم نے استرجاعی کلمات پڑھنے کے ساتھ ہی آناً فاناً دفتر اہتمام میں میر کارواں حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ صاحب مدظلہم کو یہ اندوہناک اطلاع دی تو آپ نے بے ساختہ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور فرمایا کہ ''دارالعلوم دیوبند کے ایک روشن اور تاریخ ساز عہد کا خاتمہ ہوگیا، اللہ پاک حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائے اور مادر علمی دارالعلوم دیوبند کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے حضرت مفتی صاحب مدظلہ کے متذکرہ بالا فکر مندانہ کلمات سے اس احساس کی بھی تائید ہوتی ہے کہ حضرت مہتمم صاحبؒ کا وجود اس دور قحط الرجال میں بسا غنیمت تھا، لہٰذا ان کا سانحۂ رحلت دارالعلوم دیوبند سمیت پوری ملت

کیلئے ناقابل تلافی نقصان ہے، جس کی بھرپائی بسہولت ممکن نہیں، شاعر نے غالباً آپ ہی کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؏

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہو جس کی حسرت وغم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

موت ایک اٹل حقیقت ہے، گردش شام وسحر کے باوجود اس کا رقص ہر سمت جاری ہے، کیا چھوٹے کیا بڑے کیا بوڑھے کیا جوان کیا شہرت پذیر کیا بے نام ونشان ہر ایک اس کی آغوش میں سمارہے ہیں، ہر روز بیشمار انسان منوں مٹی کے نیچے اس طرح جالبتے ہیں کہ کانوں کان خبر نہیں ہوتی، مگر بعض ہستیاں اور خاصانِ خدا کے کوچ کرنے پر صدیاں اور زمانے اشک بار ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا مرغوب الرحمن علیہ الرحمہ بھی انہی چنیدہ شخصیات کبار میں سے تھے، جن کے تقوی وطہارت، تدبر وحکمت، متانت وسخاوت اور زندہ دلی وشفقت کی بے شمار داستانیں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں، قاسمی برادری ہی نہیں پوری ملت اسلامیہ انہیں عقیدت والفت کے پھول نچھاور کررہی ہے، اسی لئے ان گنہگار آنکھوں نے بھی وہ ایمان افروز منظر دیکھا، جب ربع صدی سے زیادہ زمانی رقبہ پر محیط دارالعلوم کی بے لوث خدمت کرنے والے آخری سفر کے راہی کو دارالعلوم کے نودرہ سے مزار قاسمی کندھوں پر لیجایا جارہا تھا ہر شخص مجسم حسرت بنا ہوا نم آنکھوں سے انہیں الوداع کہہ رہا تھا اور احقر کو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث یاد آرہی تھی جو الترغیب والترہیب صفحہ نمبر ۲۵۴ رجلد نمبر ۴ رجبکہ اتحاف السادۃ المتقین صفحہ نمبر ۳۳۸ رجلد نمبر ۷ رپر موجود ہے: قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیر الناس من طال عمرہ وحسن عملہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا لوگوں میں سب سے بہتر شخص وہ ہے جس کی عمر لمبی ہو اور عمل اچھا ہو، حضرت مہتمم صاحبؒ کی

زندگی اس حدیث کی مصداق نظر آتی ہے، رب رحیم وکریم کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ دار آخرت میں عنایات الٰہی سے بہرہ ور ہو رہے ہوں گے۔

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحبؒ نے شہر بجنور میں ۱۹۱۴ء میں رئیسِ بجنور مولانا مشیت اللہ کے یہاں آنکھیں کھولیں، انکے والد گرامی امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے عقیدت مندوں میں سے تھے، آپ کے گھرانے میں علم وادب کے چرچے اور دین ودانش کے غلغلے تھے، اصحابِ فضل وکمال کا یہاں ورودِ مسعود ہوتا رہتا تھا، مولانا مرغوب الرحمن صاحبؒ نے اسی خوش گوار علمی فضاء میں تربیت پائی، درس نظامی کی ابتدائی تعلیم مقامی مدرسہ جامعہ رحیمیہ میں حاصل کی، ۱۹۲۹ء میں علوم اسلامی کی شہرۂ آفاق مرکزی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا اور یہیں باضابطہ داخلہ لیکر تعلیم کے تمام مراحل بحسن وخوبی طے کئے، دریں اثنا چند سال انقطاع کے بعد دارالعلوم ہی سے افتاء کی بھی تکمیل کی اور اس وقت کے باکمال مفتی حضرت مولانا سہول بھاگلپوریؒ کی نگرانی میں مشق ومزاولت کی، فراغت کے بعد بھی دارالعلوم کے بزرگوں سے برابر تعلق رہا بچپن ہی سے اللہ نے آپ کو اوصاف وکمالات سے آراستہ کیا تھا، مزاج میں سلامتی وخودداری اور صالح جذبات کے غیر معمولی عناصر نے آپ کی شخصیت میں مقناطیسیت کے جواہر ٹانک دیۓ تھے، اس لئے ذمہ دارانِ دارالعلوم نے ۱۹۶۲ء میں آپ کو اراکین شوریٰ میں جگہ دی، جہاں آپ کی اصابت فکر کے چراغ روشن ہوئے، آپ نے ہمیشہ دارالعلوم کے مفاد میں گراں قدر تجاویز پیش کیں جس سے آپ کی نیک نامی میں اضافہ ہوا، پھر جب حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کو ایک معاون مہتمم کی ضرورت پڑی تو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے آپ کا نام پیش کیا، جس کی تائید جملہ اراکین شوریٰ نے کی، بالآخر جب ۱۹۸۲ء میں تقسیم دارالعلوم کا قضیہ نامرضیہ پیش آیا تو اراکین شوریٰ نے باضابطہ منصب اہتمام آپ کے

حوالہ کر دیا، اس میں شک نہیں کہ دارالعلوم کی باگ ڈور آپ نے ایسے وقت میں سنبھالی تھی کہ جب نفرتوں کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں، دارالعلوم ناگفتہ بہ بحران سے دوچار تھا لیکن حضرت مہتمم صاحبؒ نے نہایت تدبر فہم وفراست، سلیقہ مندی، حوصلگی اور جرأت وحکمت کیساتھ دارالعلوم کے قافلہ کو آگے بڑھایا اور تادم آخر وہ اس کے میرِ کارواں رہے، یہاں یہ اعتراف بیجا نہ ہوگا کہ اگر دارالعلوم کو حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا تو حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحبؒ نے اسے دوام واستحکام بخشا، اس کی شہرتوں میں چار چاند لگائے، ملت کے قیمتی اثاثے دارالعلوم کی آپ نے حفاظت فرمائی، آپ کے زمانہ اہتمام میں دارالعلوم نے تعلیمی وتعمیری اعتبار سے بہت سی بلندیوں کو چھوا، تخصصات کے شعبے قائم ہوئے، روایتی شعبوں کو متحرک وفعال بنایا، اسلامی طرز تعمیر کا جدید شاہکار جامع رشید بھی آپ کے اہتمام کی پیشانی کا جھومر کہا جا سکتا ہے، الغرض تعلیم وتربیت، تعمیر وترقیات کے باب میں خوش گوار اضافے اور کامیابی حضرت مرحوم کی رہینِ منت ہیں جو نقش دوام کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحبؒ دارالعلوم کے بے لوث خدمت گذار تھے، وہ ناز ونخرے اور رئیسانہ ماحول کے پروردہ تھے لیکن سادگی قناعت پسندی، کفایت شعاری، خلوص وللہیت، تواضع وانکساری، معاملہ فہمی، راست گوئی، فرض شناسی، دیانت داری، شرافت وہمدردی ان کی ذات کا ناقابل انفکاک حصہ تھی، بندہ نے دارالعلوم میں اپنے دس سالہ ایام طالب علمی میں ان کے الطاف وعنایات کا مشاہدہ کیا اور ان کے خوانِ نعمت سے مستفید بھی ہوا، وہ طلبہ پر بے حد شفیق تھے، آپ طلبہ کی تربیت کے بارے میں متفکر نظر آتے تھے، ان کا خیال تھا کہ ؏

کورس تو الفاظ ہی سکھاتے ہیں لیکن آدمی بناتے ہیں

ایک مرتبہ بعض شہریوں سے طلبہ کی جھڑپ ہوگئی اور طلبہ نے انتظام کو متحرک نہ دیکھ کر صدائے احتجاج بلند کردی، بالآخر انتظامیہ حرکت میں آگئی اور مسجد رشید میں ایک ہنگامی اجلاس طلب کرلیا گیا، حضرت مہتمم صاحبؒ بذات خود تشریف لائے، طلبہ نے اپنے مطالبات آپ کے سامنے رکھے، حضرت نے تربیتی پہلو اختیار فرمایا اور کہا کہ طلبہ اپنی جائز مشکلات کے مداوے کیلئے درخواست کریں، مطالبہ یا ایجی ٹیشن کرنا کالج اسکول اور سیاسی پارٹیوں کا طریقہ ہے جو دینی مدارس کے طلبہ کی شان نہیں ہے۔

آپ کے منصب اہتمام پر متمکن رہتے ہوئے اندرون و بیرون ملک بہت سے موڑ آئے، عالمی منظرنامے پر شہ اور مات کے کھیل دیکھنے کو ملے، عالم اسلام نے موافق ومخالف دونوں ہواؤں کا سامنا کیا، افغانستان میں طالبان حکومت کا عروج وزوال، نائن الیون کا حادثہ، اسلام کے خلاف فرعونی لشکروں کی ناکہ بندی، ہندو پاک کے مابین تعلقات کے نشیب وفراز، غرض ہر موقع پر مولانا مرغوب الرحمن صاحبؒ نے دارالعلوم کے اسٹیج سے ہندی مسلمانوں کے صحیح احساسات وجذبات کی ترجمانی کا فریضہ ادا کیا اور مادرِ علمی کے سائبان کو ہر قسم کی تپش سے محفوظ رکھا یقیناً اس میں ان کی مؤمنانہ فراست اور تقرب الٰہی کا خاص دخل تھا، حضرت مہتمم صاحبؒ کی کن کن خوبیوں کا تذکرہ کریں، حق جل مجدہ نے انہیں بے شمار خصوصیات سے مالا مال کیا تھا، دفاع عن الدین کے بارے میں وہ ہمیشہ مستعد نظر آتے تھے، باطل فرقوں کے مسموم اثرات سے مسلمان بچوں کی حفاظت، اسلام اور مسلمانوں کے تئیں مغربی میڈیا کے منفی کردار کی تغلیط و مذمت، اپنے مسلک پر آنچ آئے بغیر دوسروں کے ساتھ ملی امور پر تبادلۂ خیال اور مشارکت، نیز امت کی شیرازہ بندی انکی دینی تڑپ وملی شعور کا ایسا صاف وشفاف آئینہ ہے جس سے ان کی ہشت پہل شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے، آج اگرچہ وہ اجنبی شہر کے باسی ہیں لیکن آپ کی ناقابل فراموش خدمات

کے سہارے انکی یادوں کے روشن چراغ یونہی ضیاء پاشی کرتے رہیں گے۔

موت اس کی ہے کرے جس پہ زمانہ افسوس　　　یوں تو سب آئے ہیں اس دنیا میں مرنے کیلئے

(یہ مضمون ماہنامہ دارالعلوم دیوبند بابتہ ماہ جنوری، فروری ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا)

سونا پڑا ہے باغ کہ بلبل نہیں رہا

شیخ الحدیث مولانا علامہ محمد عثمان غنی قاسمیؒ

برصغیر ہندو پاک کی دوسری بڑی اور شہرۂ آفاق دینی وعلمی درسگاہ جامعہ مظاہر علوم وقف سہارنپور کے شیخ الحدیث اور مشہور شارح بخاری حضرت مولانا محمد عثمان غنی قاسمی بھی ۱۳ر جنوری ۲۰۱۱ء کی علی الصباح داغ مفارقت دے گئے وہ ایک عرصے سے علی شرف الرحیل تھے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا محمد عثمان غنیؒ جنہیں اب رحمۃ اللہ علیہ لکھنے کی مشق کے لئے بھی ایک وقت درکار ہے، دارالعلوم دیوبند کے ان فخر روزگار قدیم ترین فضلاء میں سے تھے جنہوں نے نہ صرف علمی حلقوں میں اپنی منفرد شناخت بنائی بلکہ مادر علمی کی پاکیزہ روایتوں کو آگے بڑھایا، افسوس کہ گلشن علم وادب کی آبیاری کرنے والی ایسی عبقری شخصیات اس جہان فانی سے رخت سفر باندھ رہی ہیں ویسے تو کار جہاں دراز ہے، چلتا ہی رہے گا اور رب قدیر وبصیر ہر زمان ومکان میں دین وشریعت کے فرزانے بھیجتا ہی رہے گا، لیکن مشاہدات بھی بہرحال

اس بے غبار حقیقت کے غماز ہیں کہ ہر جانے والے کے پیچھے بظاہر نا قابل تلافی خلا واقع ہو رہا ہے، اب سے پیشتر کی صدیوں بلکہ دہائیوں پر نظر ڈالئے کیسے کیسے حقائق ودقائق اور علوم ومعارف کے بحر بیکراں گم ہو گئے اپنے اپنے وقت کے شبلی وجنید اولیاء اللہ عارفین باللہ علم وعمل کے روشن چراغ بجھ گئے، تاریکی نے اپنے پاؤں پسارے مگر حضرت علامہ محمد عثمان غنیؒ کی شکل میں ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے۔

دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کی ڈیڑھ سو سالہ زندگی بہر نوع کامیابیوں وکارناموں کا ایک روشن عنوان ہے اس کے سن قیام سے لے کر تادم تحریر اگر بنظر عائر دیکھیں تو علی حسب الاحوال والزمان ہر دور میں اصحاب فضل وکمال کا یہاں بسیرا رہا ہے، جن کے مستفیدین وتلامذہ نے یہاں کی چہار دیواری سے نکل کر اپنی مادر علمی کے ہمہ جہت تعلیمی وفکری مشن کو تیقظ وبیدار مغزی کے ساتھ فروغ دیا۔

یہاں کے فارغین جہاں بھی گئے خوب نام کمایا، مرجع علوم ٹھہرے، تحقیق وتدریس کے شناور بلکہ غواص ثابت ہوئے، علم وعمل کی کیاریوں کو شاداب کیا، یورپ کی متعدد اکیڈمیاں بھی باہم مل کر وہ کام نہیں کرسکیں جو حق تعالیٰ کے فضل سے ان مدارس کے بوریہ نشینوں نے کر دکھایا، حضرت مولانا محمد عثمان غنیؒ بھی اپنے مولد چلمل بیگوسرائے (بہار) کے بعض مدارس میں ابتدائی تعلیم حاصل کر کے ۱۹۴۶ء میں اپنے رفقاء کی معیت میں دارالعلوم دیوبند آئے، خوش نصیبی کہ امتحان میں آپ کامیاب رہے آپ نے یہاں ایام طالب علمی کے پانچ سال گذارے، دریں اثناء متعدد اساتذہ کرام کے سامنے آپ نے زانوئے تلمذ طے کیا، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بخاری شریف، ترمذی شریف اول، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ سے ترمذی شریف جلد ثانی، ابوداؤد شریف، شمائل ترمذی اور ہدایہ نیز حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ سے مسلم

شریف وغیرہ پڑھ کر ۱۹۵۰ء میں سند فراغت پائی، دارالعلوم دیوبند سے علوم وفنون کی تکمیل کر کے میدان تدریس میں قدم رکھا، صوبہ جھارکھنڈ کے ممتاز مدرسوں میں درس نظامی کی امہات کتب آپ نے نہایت سلیقے سے پڑھائیں اور ثابت کر دیا کہ طریقۂ تدریس، تفہیم ابحاث میں انہیں ید طولیٰ حاصل ہے، بعض کتب کے مشکل مقامات ومسائل کو چٹکیوں میں حل کر دینا اور مخاطب کو مطمئن بلکہ محظوظ کر دینے کا بھر پو سلیقہ ومہارت انہیں مبدأ فیض سے ودیعت ہوا ہے، انہوں نے جس جانفشانی، یکسوئی اور محنت بسیار سے تحصیل علوم واستعداد کا مرحلہ طے کیا تھا تدریسی زندگی کے ہر موڑ پر اس کا عرفان ہوتا رہا، دنیاوی جھمیلوں سے گویا انہیں نفرت رہی، تحقیق وتدریس ہی ان کا اوڑھنا بچھونا رہا، بندہ کو یہ بات لکھنے میں کوئی تکلف محسوس نہیں ہوتا کہ اگر چہ ان کا خمیر سرزمین بہار وجھارکھنڈ سے اٹھا تھا لیکن مغربی یوپی سے معدن علم وفن ہونے کے سبب علامہ عثمان غنی کو عشق کی حد تک لگاؤ تھا وہ یہاں کے بزرگوں اور باکمال مشاہیر فکر وفن کے شاگرد اور تربیت یافتہ تھے، آپ بھی ان کے علوم، ان ہی اکابر واسلاف کے پرتو اور انہی کے فیوض وبرکات کا اثر معتبر تھے، ان کی صحبت کیمیاء کو سرمایہ نجات اور مدارج ترقی گردانتے تھے، چنانچہ گلشن قاسمیہ کے اس عندلیب خوش نوا نے مدرسہ دارالعلوم تاراپور میں کچھ دن چہکنے کے بعد جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کو ۹ر شوال المکرم ۱۴۰۹ھ کے مبارک اور خوشگوار ساعات ولمحات میں آخری لمحاتِ حیات تک کیلئے آپ نے بسیرے کیلئے آشیانہ تجویز کرلیا اور اپنے شیخ ومرشد فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی مظفر حسین قدس اللہ سرہٗ کے ایماء پر یہاں کی مسند حدیث کو رونق بخشی، اس اہم مسند کی معتبریت کو برقرار رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا، اسی مسند سے کبھی حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ، حضرت مولانا عبدالرحمن کامل پوریؒ، حضرت مولانا عبداللطیف پور قاضویؒ اور ریحانۂ ہند حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا

کاندھلوی قدس اللہ اسرارہم جیسے نابغۂ روزگار رجالِ حدیث نے قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں دل نواز بلند کی تھیں اور ان شمعوں پر علم حدیث کے پروانے دیوانہ وار جمع رہتے تھے، حضرت موصوف نے مظاہر علوم کی دیرینہ علمی روایتوں کو چار چاند لگائے، اپنی خداداد صلاحیتوں کے سبب علامہ کے لقب سے مشہور ہو گئے، اور آپ نے یہاں بھی اپنی صلاحیتوں کے چراغ روشن کئے، نہایت یکسو ہو کر کاروانِ علم کو سیراب کرتے رہے وہ خود کو تدریسی و تصنیفی مشغلے میں منہمک رکھتے کون کیا کہہ رہا ہے اس سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا، ان میں فرض شناسی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، راقم الحروف نے ایک مرتبہ شرف ملاقات حاصل کرنے کیلئے تکمیل افتاء کے سال ان کے دروازہ پر دستک دی فوراً اندر آنے کا حکم صادر ہوا داخل ہوا تو چاروں طرف کتابوں کا انبار اور سامنے قلم وقرطاس، دھیمی آواز میں گویا ہوئے، احقر سمجھا کہ نقاہت کے آثار زبان پر بھی ہیں مگر سال کے اخیر میں ختم بخاری شریف کے آخری اجلاس میں آخری حدیث پر ان کی تقریر دل پذیر سنی تو بے ساختہ ذہن کی اسکرین پر زمیندار کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں مرحوم کا وہ شعر ابھرا کہ ع

چھائے ہیں مجلسوں میں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

الفاظ کا زیر و بم جس طرح استاذ محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر احمد خاںؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کے یہاں تھا وہی انداز مولانا مرحوم کے یہاں بھی دیکھنے کو ملا، زبان صاف ستھری اور نشست و برخاست باوقار، بہر کیف جب حدیث پر گفتگو کی تو دل کو موہ لیا ان کی محدثانہ شان واقعی دیدنی تھی، دارالعلوم دیوبند کے بہت سے محققین کے اقوال بالخصوص اپنے نامور استاذ گرامی شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنیؒ کی آراء بھی بسا اوقات ذکر کر دیتے جیسا کہ بعض کی زبانی معلوم ہوا۔

تدریس کے ساتھ ہی تحریری ذوق بھی اللہ رب العزت نے انہیں بخشا تھا،
چنانچہ آپ کے خامہ شمامہ عنبر سے نصر الباری جیسا علمی متاع گراں مایہ معرض وجود میں آیا
جو بزبان اردو بخاری شریف کی پہلی کامل ومکمل شرح ہے جو آپ کی تحریری کاوشوں کا شاہ
کار اور آپ کے علمی انہماک کا زندۂ جاوید کارنامہ ہے، علم حدیث کے رسیا حضرات اس
سے مستفید ہورہے ہیں، یقیناً آپ کیلئے یہ بہترین صدقۂ جاریہ ہے، حضرت مولانا محمد
عثمان غنیؒ کو نصر الباری جیسی مؤقر شرح کے طفیل کبار محدثین کے زمرہ میں ان شاءاللہ ہمیشہ
یاد رکھا جائے گا، مفتی اعظم ہند حضرت مولانا محمود حسن گنگوہیؒ کے مجاز بیعت اور جامعہ
اشرف العلوم رشیدی کے استاذ حدیث حضرت مولانا محمد سلمان مظاہری زید مجدہم نے ان
سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ خالص لکھنے پڑھنے والے ایک علم پرور
انسان تھے، علم وعمل کے آثار ان کی روشن جبیں سے ہویدا تھے، حضرت مولانا مرحوم
سلوک واحسان میں بھی ایک کامل انسان تھے، بیعت واسترشاد کا تعلق اولاً اپنے شیخ
حضرت مدنیؒ سے قائم کیا اور مجوزہ اوراد ووظائف پر عامل رہے پھر فقیہ الاسلام حضرت
مولانا مفتی مظفر حسینؒ سے بھی روحانی وابستگی ہوگئی جہاں آپ کو خرقۂ خلافت عطا کیا گیا،
اس طرح آپ کی ذات میں حسین نسبتیں سماں گئی تھیں۔

۹؍افراد آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے، آج آپ کے حادثۂ رحلت پر
پوری علمی برادری سوگوار ہے، جابجا تعزیتی جلسے منعقد ہورہے ہیں، اخبارات ورسائل بھی
ماتم کررہے ہیں، دین ودانش کے حدی خواں انہیں خراج عقیدت پیش کررہے ہیں، آپ کی
روحانی اولاد آپ کے مشن کو زندہ وجاوید رکھنے کیلئے پرعزم ہے لیکن علامہ عثمانؒ اب اپنے
مرشد فقیہ الاسلام کے پہلو میں ہمیشہ کیلئے آسودۂ خاک ہیں۔

(یہ مضمون ماہنامہ ''آئینۂ مظاہر علوم'' بابتہ ماہ مئی ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا)

رفتید ولے نہ از دل ما

استاذ العلماء حضرت مولانا رئیس الدین بجنوریؒ

علم وعمل کی قدیم شہرۂ آفاق دینی درسگاہ جامعہ مظاہر علوم (وقف) سہارنپور کے سابق شیخ الحدیث نامور شارح بخاری حضرت مولانا علامہ محمد عثمان غنی قاسمی کے حادثۂ وفات کے زخم مندمل بھی نہ ہوسکے تھے کہ اچانک ۴؍مارچ ۲۰۱۱ء مطابق ۲۸؍ربیع الاول ۱۴۳۲ھ کو بین العشائین نو منتخب شیخ الحدیث اور شارح ترمذی حضرت مولانا رئیس الدین مظاہری اس عالم ناپائیدار سے رحلت فرماگئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا کے سانحۂ وفات کو اوساط علمیہ میں شدت تکلیف کے ساتھ غیر معمولی حادثہ قرار دیا گیا نیز ان کے ایصال ثواب کے لئے علمی مراکز اور دینی جامعات میں قرآنی مجالس اور تعزیتی جلوس کا انعقاد عمل میں آیا، حق تعالیٰ شانہ انہیں جنت الفردوس میں داخل فرمائیں اور جملہ پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے آمین۔

حضرت مولانا رئیس الدین بجنوری نے یکم ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۳ء کو ضلع بجنور یوپی کے (تھے پور) گاؤں میں الحاج جمیل احمد کے یہاں آنکھیں کھولی، ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کر کے بعمر ۱۷؍سال ۱۴؍شوال المکرم ۱۳۹۰ء مطابق ۱۴؍دسمبر ۱۹۷۰ء کو مظاہر علوم سہارنپور میں داخل ہوئے، جہاں آپنے اس وقت کے نامی گرامی اساتذۂ کرام کے سامنے شرف تلمذ حاصل کیا اور بالآخر ۱۳۹۴ھ میں دورۂ حدیث کا امتحان دیکر امتیازی نمبرات سے ظفریاب ہوئے۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات مولانا بچپن ہی سے صالح مزاج اور طبعاً نیک واقع ہوئے تھے اسی لئے محض ۲۵ رسال کی عمر میں مناظر اسلام حضرت مولانا شاہ محمد اسعد اللہ رحمۃ اللہ نے آپ کو خرقۂ خلافت عطا فرما دیا تھا، مولانا مرحوم نے اپنے مرشد کے بتائے ہوئے اوراد و وظائف کو حرز جاں بنالیا تھا، اکابر علماء سے آپ کا تعلق نہایت مستحکم اور مضبوط تھا اور ان کے ہاں حاضری و خدمت کو سرمایہ سعادت سمجھتے تھے، مشفق اساتذۂ کرام کی دعائیں قدم بقدم چراغ راہ ثابت ہوئیں جس سے آپ کی بامقصد علمی زندگی کا کامیاب سفر شروع ہوا، نیک نامی آپ کی ذات کا ناقابل انفکاک حصہ قرار پائی، مولانا جس زمانہ میں اپنے ہمہ جہت تعلیمی مشن کے تحت کسی مؤقر علمی درسگاہ کے متلاشی تھے حسن اتفاق کہ وہ جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ کا عہد پر شباب تھا، اس کے بانی اور اپنے وقت کے درویش ولی کامل حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحبؒ نے اصحاب فضل وکمال اور دین و دانش کے فرزانے یہاں رکھ چھوڑے تھے، یہی وجہ تھی کہ دارالعلوم دیوبند مظاہر علوم سہارنپور جیسے مرکزی اداروں کے اساتذہ وذمے داران اپنے متعلقین کو زیور تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنے کیلئے یہاں بھیجا کرتے تھے، اسے بانیٔ جامعہ کا اخلاص کہیں یا بزرگوں کی توجہاتِ روحانی کا اثر کہ جامعہ اشرف العلوم رشیدی کا فیض برصغیر سے ہوتے ہوئے دور دراز علاقوں اور خطوں تک جا پہنچا ہے ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

حضرت مولانا رئیس الدین بجنوری بھی فراغت کے ایک عرصہ بعد یہاں مدرس ہو کر فروکش ہوئے اور ابتداء سے انتہاء تک کی تمام کتب متداولہ آپ نے سلیقہ مندی سے پڑھائی، کم وبیش ۲۲/۲۳ رسال تک یہاں آپ کا قیام رہا، سات سال تک ترمذی شریف کا بھی درس دیا، یہاں دوران قیام بے شمار طلبہ آپ سے فیضیاب ہوئے، جامعہ ہذا

کے موجودہ روح رواں حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ صاحب مدظلہم کے علاوہ حضرت مولانا محمد سلمان بجنوری استاذ ادب عربی دارالعلوم دیوبند، مولانا مفتی رئیس احمد خان مفتی شہر بھوپال، مولانا محمد عرفان قاسمی کھجناوری، مولانا قاری عبدالرؤف بلند شہری استاذ دارلعلوم دیوبند وغیرہ آپ سے گنگوہ کے قیام میں شرف تلمذ رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بے شمار خوبیوں کے مالک تھے، نہایت ظریف، خوش طبع، بذلہ سنج اور باصلاحیت انسان تھے درس نظامی انہیں ازبر تھا تمام چھوٹی بڑی کتابیں انہیں یاد تھی، مشکل ترین ابحاث اورادق مقامات کی تسہیل وتفہیم ان کیلئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

گنگوہ کا قیام اور یہاں کا علمی ماحول انہیں خوب بھایا جس سے ان کی ترقی کی راہیں مزید روشن ہوئیں، بالآخر یہاں کی کامیاب تدریسی زندگی ان کیلئے حوالہ شناخت بن گئی اور وہ فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی مظفر حسین اجراڑوی کے ایما پر مظاہر علوم تشریف لے گئے جہاں ۱۴۱۱ھ میں بحیثیت استاذ حدیث آپ کا تقرر کرلیا گیا، مسلم شریف اور ابوداؤد وغیرہ کے اسباق آپ سے متعلق کئے گئے، مظاہر علوم میں آپ نے ترمذی جلد ثانی بھی پڑھائی کچھ عرصہ قبل تک بخاری جلد ثانی اور ترمذی جلد اول پڑھاتے رہے، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عثمانؒ کے جوار رحمت میں جابسنے کے بعد مظاہر علوم کی انتظامیہ نے شیخ الحدیث کے عہدہ پر آپ کا تقرر کیا تھا، مولانا جلد اول کے اسباق پڑھا رہے تھے کہ آپ کا بھی وقت موعود آپہنچا اور آپ نے بھی جان جاں آفریں کے حوالہ کردی۔

رحیل مغفور کی پوری زندگی علم وعمل سے عبارت تھی، صلاحیت اور صالحیت کے حسین امتزاج نے انہیں لائق رشک محبوبیت بخشی تھی جس کا مشاہدہ ان کے حادثۂ سفر آخرت کے وقت بھی ہوا، راقم السطور ششماہی امتحان کی تعطیلات اپنے گھر کھجناور گذار کر گنگوہ واپس ہورہا تھا دریں اثنا خیال ہوا کہ کیوں نہ مظاہر علوم کے اکابر سے ملاقات

کرتے چلیں، اسی دوران حضرت مرحوم کے انتقال کی خبر صاعقہ بن کر گری، کافی دیر تک تو یقین ہی نہیں آیا لیکن فون کی متواتر کالوں نے اس حادثۂ فاجعہ کا ایقان کرا ہی دیا، باہر دیکھا تو طلبہ کا اژدحام حضرت کے مکان کی طرف بڑھ رہا تھا، حضرت مولانا محمد سعیدی مدظلہ اور بعض اساتذۂ کرام ایک دوسرے سے تعزیت فرما رہے تھے اور احقر کے ذہن کے کینوس پر عربی شاعر کا وہ تاثر ابھر رہا تھا کہ

وما كان قيس هلكه هلك واحد ولكنه بنيان قوم تهدما

بالآخر اگلے روز دارالطلبہ قدیم میں آپ کی نماز جنازہ حضرت مولانا نسیم غازی دامت برکاتہم (شیخ الحدیث مدرسہ جامع الہدیٰ مرادآباد) نے پڑھائی اور ہزاروں سوگوار وں کی موجودگی میں حاجی شاہ کمال الدین قبرستان میں آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

(یہ مضمون ماہنامہ صدائے حق بابتہ ماہ اپریل ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا)

رجلِ رشید، میدانِ معرفت وسلوک کے رکنِ رکین

حضرت مولانا سید محمود حسن پٹھیڑویؒ

اس کارگاہِ ہستی میں بھلا قرار کسے نصیب ہوا؟ یہاں تو ہر شخص آیا ہی اس لئے کہ وہ اپنی حیاتِ مستعار کو حق جل مجدہ کی خوشنودی کے حصول میں صرف کر کے وہاں کی لازوال نعمتوں کا مستحق قرار پائے اور زہے قسمت اگر بوقتِ رحلت بارگاہِ خداوندی سے رضاجوئی کا یہ پروانہ بھی نصیب ہوجائے جس کی طرف ذیل کی یہ آیتِ قرآنی مشیر ہے"یا ایتھاالنفس المطمئنة ارجعی الیٰ ربک راضیة مرضیة فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی"۔

گذشتہ ۲۵ / مارچ ۲۰۱۱ء بروز جمعہ کو سلوک ومعرفت کی عبقری شخصیت عارف باللہ زاہد مرتاض حضرت مولانا سید محمود حسن پٹھیڑویؒ (بعمر اٹھاسی سال) کے انتقال کی اندوہناک خبر سے دل ودماغ گویا ماؤف ہوکر رہ گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون کے کلمات زبان پر جاری تھے کہ ذہن فوراً آیت مذکورہ کی طرف گیا جس میں سعادت مند روحوں کو بہشت میں داخلہ کا مژدۂ جانفزا گوش گذار کیا گیا ہے۔

حضرت مولانا کو جن حضرات نے دیکھا ہے وہ گواہی دیں گے کہ ظاہری ٹیپ ٹاپ اور شاہی کروفر سے بے نیاز یہ درویش اور ولی کامل شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے آستانے پر گوشۂ خلوت میں بیٹھ کر ریاضت ومجاہدات، عبادتِ الٰہی، ذکر وفکر، تلاوتِ قرآن، اوراد وظائف جیسے معمولات پر کاربند رہا، انجذاب الی اللہ کی کیفیت نے اپنے مرشد حضرت مدنیؒ کا کچھ ایسا دامن گرفتہ بنادیا تھا کہ ان کے وصال کے

بعد بھی اخیر میں آپ وہیں کے ہو کر رہ گئے تھے، اجازت وخلافت بھی حضرت مدنیؒ سے حاصل تھی، آہ صد آہ! کہ بزم مدنی کا یہ روشن چراغ بھی ہمیشہ کیلئے گل ہوگیا۔

حضرت مولانا محمود حسن علیہ الرحمہ شہر سہارنپور سے تقریباً ۲۰ رکلومیٹر دور مضافاتی گاؤں پٹھیڑ میں سادات خانوادے کے چشم وچراغ تھے، وہیں سے آپ کا خمیر اٹھا تھا لیکن دیوبند میں تعلیم وتربیت کے مراحل طے ہوئے اور دامنِ مراد بھی یہیں سے بھرا۔

آپ کی زندگی بے شمار خوبیوں سے آراستہ اور جامع الاوصاف والکمالات تھی، زاہد فی الدنیا، راغب فی الآخرۃ اور سلوک واحسان میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، دنیا ومافیہا سے بیزار بس اللہ اللہ ہی ان کا محبوب مشغلہ اور اسی سے ان کو راحت وقرار، بارہا مجلس میں جانے کا اتفاق ہوا زبانِ حال سے اور زبان قال سے بھی بس ایک ہی سبق اور اسی کا ورد سننے اور دیکھنے کو ملا۔

تقریباً ایک دہائی قبل جب یہ نامۂ سیاہ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کے ابتدائی مراحل میں تھا تو اکثر یہ چرچے زبان زد رہتے کہ حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ دیوبند آرہے ہیں جارہے ہیں، زیارت کا اشتیاق جب زیادہ ہی بڑھا تو ایک روز بعد عصر ان کے آستانہ مدنی منزل میں احقر بھی جا پہنچا، وہیں ایک نورانی شخصیت پر نگاہ ٹھہر گئی استفسار کرنے پر کسی نے بتایا کہ یہ حضرت مولانا سید محمود حسن پٹھیڑوی ہیں، اہل دل اور صاحب فضل وکمال ہیں، شیخ الاسلام حضرت مدنی کے خلیفہ اور ان کے عاشق زار، حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ اور تمام اکابران کی نسبت کا لحاظ کرتے ہیں اور ادب واحترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں، بس یہیں سے ان کی محبت کا سکہ دل پر بیٹھ گیا، اس کے بعد متعدد مرتبہ ان سے مستفید ہونے کے قیمتی لمحات میسر آئے بلکہ اپنے وطن کھجناور بھی آپ کی ہمرکابی میں جانا ہوا، آپ کے اس قافلہ میں دارالعلوم کے بعض ذمہ داران کے علاوہ مؤقر اساتذۂ کرام اور کچھ

دوسرے اہم حضرات بھی شامل تھے، حضرت کے فیوض وبرکات ماشاء اللہ وسیع پیمانہ پر پھیلے، سرکردہ علماء، مذہبی شخصیات اور سربرآوردہ حضرات آپ کے حلقۂ بیعت میں شامل بلکہ اجازت وخلافت یافتہ ہیں، جس کا اندازہ ان کے خلفاء کی فہرست سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ شریف الامت حضرت مولانا قاری شریف احمد گنگوہیؒ سے بھی خاص تعلق تھا اوران دونوں بزرگوں کی باہمی ملاقات کا خوش گوار منظربس دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

حضرت مولانا اپنے انتقال سے چند ہی روز قبل جامعہ اشرف العلوم رشیدی میں اپنے خلیفہ مولانا مفتی خالد سیف اللہ صاحب سے بغرض ملاقات تشریف لائے تھے، لیکن آپ کے بیرون ملک ہونے کے سبب ملاقات نہ ہوسکی تھی، اتفاق کہ ۲۵/مارچ کو جب حضرت مہتمم صاحب بھی دیوبند ہی میں تھے آپ کے وصال کی خبر ملی، آخری دیدار کیلئے مدنی منزل جانا ہوا بعد نماز مغرب احاطۂ مولسری میں نماز جنازہ ادا کی گئی جس میں علماء صلحاء، فضلاء اور طلباء کا جم غفیر تھا، بعدازاں آپ کو قبرستان قاسمی میں سپرد خاک کردیا گیا۔

فقہ وفتاویٰ کے رمز شناس

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی

ازہر الہند دارالعلوم دیوبند میں نصف صدی سے زائد زمانی رقبہ پر محیط فقہ وفتاویٰ درس وتدریس اور تحریر وتقریر کے اسٹیج پر چھکنے والے استاذ اکبر اور اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے صدر نشیں حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی اپنی حیات مستعار کی پچاسی بہاریں دیکھ کر وطن مالوف دربھنگہ (بہار) میں دار آخرت کو سدھار گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مفتی صاحب مرحوم ادھر ایک مدت سے علیٰ شرف الرحیل تھے، آپ علم پرور ادب نواز اور علم کے رسیا تھے، اسی لئے علمی حلقوں میں آپ کا قد بہت اونچا تھا، فقہ وفتاویٰ کی جزئیات وکلیات کا استحضار دیدنی تھا، چنانچہ دارالعلوم کے ارباب انتظام نے فتاویٰ مفتی عزیز الرحمن عثمانی کی ترتیب وتبویب کا محنت طلب کام آپ سے کرایا جو ۱۲ رجلدوں میں فتاویٰ دارالعلوم کے نام سے مقبول ومتعارف اور متداول ہے، علاوہ ازیں مختلف عناوین پر آپ کے قلم اشہب کی دینی، علمی، تحقیقی اور سوانحی گلکاریاں کتابوں کی شکل میں موجود ہیں، آپ کے علمی معارف ومآثر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح انہوں نے اتنے تحقیقی کارہائے نمایاں انجام دے، وہ دارالعلوم کی سابق انتظامیہ کے نور نظر تھے، حکیم الاسلام قاری محمد طیب علیہ الرحمہ سے نیاز مندانہ تعلق رہا، انہیں کی فرمائش پر ۱۹۵۶ء میں دارالعلوم کی ملازمت اختیار کی، اس درمیان دارالعلوم میں بہت

سے نشیب وفراز آئے لیکن حضرت مرحوم ان جھمیلوں سے دور رہے اور اپنے فرائض
انجام دیتے رہے، معاصر بزرگوں کا احترام اور بڑوں سے تعلق بھرپور رہا، علامہ سید
سلیمان ندوی جیسے گل سرسبد بھی آپ کے قدرداں تھے جس کا اندازہ باہمی مراسلت اور
مکتوبات سے بخوبی ہوتا ہے، زندگی کا علمی سفر اغلباً آپ کی آخری خودنوشت ہے جس سے
حضرت مفتی صاحب کی بھاری بھرکم شخصیت کے بہت سے مستور گوشے وا ہوتے ہیں۔

یادداشتوں کے سہارے اگر بات کی جائے تو ان سے شفاہی ملاقات برادرم
مولانا فاروق اعظم عاجزؔ نزیل جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے وساطت سے سال ششم میں
پڑھتے ہوئے ان کے رہائشی کمرہ میں ہوئی، دراصل ایک دینی مجلہ کیلئے ان کا پیغام
مطلوب تھا مفتی صاحب قلم برداشتہ لکھتے تھے احقر کی درخواست پر فوراً پیغام تحریر کیا اور
تعلیمی احوال کے بارے میں معلومات کی حضرت مولانا بے شمار خوبیوں کے مجموعہ تھے
سادگی، قناعت ہر حال میں رضا وشکر پسندی آپ کا شیوہ رہا، دیکھنے میں ایک معمولی قسم
کے انسان لیکن علم وعمل کے حسین سنگم ہر شخص بے تکلف ان کی مجلس میں حاضری کی
جسارت کر لیتا، نہایت خندہ پیشانی سے آنے والے کا استقبال فرماتے، ملک کے مرکزی
اداروں اور دینی تنظیموں کے سربراہان بھی آپ کے قدرداں اور آپ سے مشاورت
فرماتے، فقیہ الزمن حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کے انتقال کے بعد تو علماء نے
باتفاق رائے آپ کو اسلامک فقہ اکیڈمی کا کل ہند صدر چن لیا تھا، چنانچہ آپ کی مدت
صدارت میں عہد جدید کے پیدا شدہ بہت سے مسائل کے فقہی حل کیلئے بارہا اہل علم
سر جوڑ کر بیٹھے، متعدد علمی سمینار منعقد ہوئے، حضرت مفتی صاحب وسیع المشرب ضرور
تھے مگر حزم واحتیاط بھی پیش نظر رکھتے اور اسی پر عامل وثابت رہتے۔

گردوپیش کے حالات پر آپ کی چشم بصیرت مرکوز رہتی، صاحب ردالمحتار

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے بھی اس طرف فقہاء امت اور ارباب فتاویٰ کی توجہ مبذول کرائی ہے، چنانچہ کہیں لکھا ہے من لم یعرف احوال زمانه فهو جاهل الحمدللہ مفتی صاحب اس بابت نہایت زیرک اور مزاج شناس واقع ہوئے تھے اپنی انتہائی سادگی کے باوجود مستفتی کو پرکھنے میں دیر نہیں کرتے تھے، دارالافتاء دارالعلوم کے نقول فتاویٰ کے رجسٹر آپ کی فقیہانہ بصیرت کے آئینہ دار ہیں، افسوس کہ حضرت مفتی صاحب جیسے اصحاب فضل وکمال اس دنیا سے بہت تیزی کے ساتھ رخت سفر باندھ رہے ہیں، آپ کی وفات موت العالم موت العالَم کی مصداق ہے، اللہ آپ کو غریق رحمت فرمائے، جملہ پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے اور امت کو ان کا نعم البدل عطا کرے، ایں دعاء از من واز جملہ جہاں آمین باد۔

(یہ مضمون ماہنامہ صدائے حق بابتہ ماہ اپریل ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا)

گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت

حضرت مولانا مظفر الحسن مظاہری

گذشتہ ماہِ جون کی ۱۹/ ۲۰ رتاریخ رہی ہوگی کہ شب میں تقریباً ساڑھے گیارہ بجے موبائل کی گھنٹی بجی، فون رسیو کیا تو حضرت مولانا مظفر الحسن مظاہری ندوی بول رہے تھے، علیک سلیک کرتے ہی فرمانے لگے ارے بھائی! کیا حال ہے؟ کافی دنوں سے ملاقات ندارد ہے فون پر بھی رابطہ نہیں آخر کیوں؟، پھر خود ہی گویا ہوئے کہ ہاں آخری ایام چل رہے ہیں تمام تر توجہ درسی کتب کی تکمیل پر مرکوز ہوگی، راقم الحروف نے اثبات میں جواب دیا، مکالمہ آگے بڑھا ہنس ہنس کر گفتگو کرتے رہے وہی خوش گفتاری بذلہ سنجی اور دل موہ لینے والی ناقابل فراموش باتیں ان کی نوک زبان رہیں، بالکل آخر میں بولے کہ ۲۳ رجون کو ناچیز کی تحریک پر اصلاح معاشرہ کے عنوان سے یہاں محلہ کے دین پسند نوجوانوں کے تعاون سے ایک دینی اجتماع منعقد ہو رہا ہے کلیدی خطاب کیلئے حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ مدظلہم مدعو ہیں آپ بھی شرکت کرلیں، خاکسار نے حاضری کی ہامی تو بھر لی مگر افسوس کہ ایمرجنسی مشغولیات بروقت سدراہ بن گئیں اور ان سے اس کے بعد ملاقات کی حسرت دل ہی دل میں رہ گئی۔

آخر کسے معلوم تھا کہ باغ و بہار شخصیت کے مالک مولانا مظفر الحسن اچانک ہمارے درمیان سے اس طرح رخصت ہوجائیں گے کہ ان کی یادوں کے نہ بجھنے والے روشن چراغ ہی باقی رہ سکیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، ۲۷ رجون ۲۰۱۱ء بروز دوشنبہ کو بوقتِ دوپہر مختصر علالت کے بعد اپنے مالک حقیقی سے جاملے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

رحلت کی خبر ملتے ہی چاروں طرف رنج وغم کی لہر دوڑ گئی، فون پر فون بجنے لگے

احقر کو اس جانکاہ حادثہ نے جس صدمہ سے دوچار کیا اسے لفظوں کا لباس نہیں دیا جا سکتا، چندروز قبل ان سے فون پر ہوئی گفتگو جو آخری ملاقات کہی جا سکتی ہے ایک مرتبہ پھر کانوں میں گونجنے لگی، ان کی خوش طبعی، ملنساری، چہرہ کی مسکراہٹیں، دل آویز حکایتیں دین وملت کے لئے کی گئی ان کی مخلصانہ تگ وتاز آپ کے روشن کردار کی بقاء وبلندی کیلئے کافی ہے۔

جسم مرجاتا ہے انسان کا کردار کہاں موت ہر حال میں ہو موت ضروری تو نہیں

موت ایک اٹل حقیقت ہے ہر جاندار کو اس کا مزہ چکھنا ہے، دنیا میں کسی شخص کا آنا ہی اس کے جانے کی بدیہی دلیل ہے، اس لاریب سچائی کا آج تک کسی نے انکار نہیں کیا اور نہ ہی کیا جا سکتا، موت کا فرشتہ آتا ہے اور جسم سے روح کو ختم کر دیتا ہے، لاتعداد انسان اس مرحلہ سے ہر روز گزرتے ہیں اور لاشئی بن جاتے ہیں، مگر کچھ بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو جسمانی طور پر تو فنا ہو جاتے ہیں لیکن ان کا کردار انہیں زندۂ جاوید بنا دیتا ہے، مولانا مظفر الحسنؒ بھی کردار کے غازی تھے، لوگوں کے مابین ان کی محبوبیت کا اندازہ ان کے آخری سفر سے ہوا، انہیں کندھا دینے والوں میں علماء وصلحاء، خواص وعوام سبھی تھے، پورے شہر سہارنپور سے لوگوں کا جم غفیر ان کے جنازہ میں شریک تھا، ہر شخص نے ان کے حادثہ کی کسک محسوس کی اور ایصال ثواب کا اہتمام کیا۔

مولانا مظفر الحسن نے ۷/ نومبر ۱۹۵۰ء کو ایک دینی گھرانے میں آنکھیں کھولیں، ان کے والد گرامی حضرت مولانا عبدالمالک صاحبؒ ایک ممتاز عالم دین تھے جو مظاہر علوم سہارنپور جیسے شہرت یافتہ ادارہ کے کلیدی عہدہ دار رہ چکے ہیں، مذکورہ ادارہ کے لئے اس گھرانے کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی، عنداللہ انشاء اللہ ان کی خدمات کا اجر عظیم ان کو ملتا رہے گا۔

مظاہر علوم سے تعلق خاطر کے سبب مولانا مظفر الحسن کی تعلیم کے مراحل بھی یہیں

طے ہوئے، دریں اثناء یہاں کے بزرگوں سے خادمانہ تعلق بھی قائم ہوگیا جسے دل وجان سے خوب نبھایا، اس وقت کے درویش صفت بزرگ ناظم اعلیٰ حضرت مولانا شاہ اسعد اللہ صاحب رامپوریؒ کی خوب خدمت کی حضرت شاہ صاحب بھی آپ کو بہت عزیز رکھتے تھے، بسا اوقات آپ ہی سے اپنے خطوط کا املاء کراتے، حضرت شاہ جی کے جو مکتوبات بانیٔ جامعہ اشرف العلوم کے نام تحریر کئے گئے ہیں ان میں بھی چند ایک آپ ہی کے قلم سے ہیں۔

مظاہر علوم سے آپ کی فراغت ہوئی، آپ کے رفقائے درس میں خادم القرآن والسنہ حضرت مولانا غلام محمد وستانوی، حضرت مولانا حبیب احمد باندوی، حضرت مولانا عبدالرحیم جونپوری اور بعض کتب میں تبلیغی مرکز بستی حضرت نظام الدین دہلی کے داعی الی اللہ مولانا زبیر احمد صاحب کاندھلوی مدظلہم بھی شامل ہیں، مظاہر کے علاوہ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے بھی آپ نے کسب فیض کیا جہاں حضرت مولانا معین اللہ ندویؒ آپ کے سرپرست تھے۔

بعد ازاں عملی میدان میں قدم رکھا پھر کچھ ہی عرصہ بعد مظاہر علوم میں تقرر ہوگیا، راقم کی معلومات کے مطابق وہ دفتری امور کے علاوہ ابتدائی کتابوں کے بھی مدرس تھے، سنا ہے کہ وہاں کے کتب خانہ میں بھی ایک عرصہ تک کام کیا، الغرض ان کی زندگی کے قیمتی ایام اپنی مادر علمی کی خدمت میں گذرے جو انشاء اللہ مرحوم کے لئے ذریعۂ نجات ثابت ہوں گے، اس خاکسار پر ان کی شفقتیں بے پناہ تھیں، افتاء کی تکمیل کے بعد جب احقر کا تقرر جامعہ اشرف العلوم میں بحیثیت مدرس عربی ہوا تو معلوم ہوا کہ یہاں بھی ان کی عنایتیں شامل تھیں، مولانا یہاں کے رکن شوریٰ بھی تھے حضرت ناظم صاحب دام ظلہ بھی ان کی اصابت فکر کے بے حد قدرداں رہے اور ان کی رائے کا احترام فرماتے، افسوس کہ جامعہ ہذا بھی اپنے ایک مخلص خیر خواہ سے ہمیشہ کیلئے محروم ہوگیا، اللہ پاک آپ کے

درجات بلند فرمائے اور اپنے جوار خاص میں جگہ عنایت فرمائے، جملہ متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی کرے آمین یارب العالمین، پسماندگان میں تین صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں ہیں سب سے بڑے صاحبزادے قاری منورالحسن جامعہ میں ہی تجوید وقرأت کے مدرس ہیں، حضرت مولانا مظفر الحسن صاحبؒ کے ساتھ ہی رونق بزم بھی رخصت ہوگئی، اب تو صرف ان کی یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں، بہر کیف آپ ۶۱/سال کی عمر میں ۲۷/جون ۲۰۱۱ء بروز پیر دوپہر کو یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے:

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ مجھے

(یہ مضمون ماہنامہ صدائے حق بابتہ ماہ جولائی، اگست ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا)

ان کے باغِ علم کا ہر پھول ہی شاداب ہے

حضرت مولانا مفتی خورشید عالم دیو بندیؒ

۱۴ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ مطابق ۷ فروری ۲۰۱۲ء بروز سہ شنبہ کوعلی الصبح دیو بند میں جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ کے ایک فاضل نے یہ جانکاہ خبر سنائی کہ رات ایک بجے دار العلوم وقف دیو بند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا خورشید عالم دیو بندیؒ مختصر علالت کے بعد دار آخرت کو سدھار گئے انا للہ وانا الیہ راجعون ان کے حادثہ کی خبر سنتے ہی لگا کہ تعلیم وتربیت اور تدریس و تنظیم کا ایک عالی شان ستون زمین بوس ہوگیا ہے

جو بادہ کش تھے پرانے اب اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

مدرسہ خادم العلوم باغونوالی کے بزرگ مہتمم مولانا محمد حنیف مظاہری کا حادثۂ رحلت کیا کم تھا کہ اچانک اس تازہ صدمہ سے علمی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی اور ایک مرتبہ پھر یہ احساس شدت کے ساتھ سامنے آ کھڑا ہوا کہ آخر پے در پے عبقری ہستیوں کے رخصت ہوجانے سے ان علمی مجلسوں کی رونق کیوں کر برقرار رہ سکے گی جن کی قندیلیں اب یکے بعد دیگرے بے نور ہورہی ہیں، ہر جانے والا اپنے پیچھے پر نہ ہونے والا خلا چھوڑ کر دنیائے جہاں باقی کی طرف محو سفر ہے، ویسے بھی یہ نظام قدرت ہے کہ اس فانی دنیا میں بھلا قرار کسے نصیب ہوا؟ ہزاروں سال سے یہاں موت وحیات کا کھیل جاری ہے، کیسے کیسے علم کے فرہاد، تحقیق وتہذیب کے شناور، نکتہ سنج وزمانہ ساز بندگانِ خدا نے اس کارگاہ حیات میں قدم رکھ کر اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا لوہا لیا لیکن کل نفس ذائقۃ الموت جیسے اٹل خدائی قانون کو یہ کہتے ہوئے گلے لگالیا کہ:

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اللہ غریق رحمت فرمائے حضرت مولانا خورشید عالم صاحب کو، کہ وہ بھی مقبول ومحترم اوران باکمال لوگوں میں سے تھے جن کے علمی فیضان سے ایک عالم مستفید ہوا، آج برصغیر ہندو پاک اور دنیا کے دوسرے دور دراز خطوں میں حضرت مرحوم کے بالواسطہ یا بلا واسطہ باتوفیق شاگرد علوم دینیہ کی اشاعت وحفاظت میں کلیدی رول نبھار ہے ہیں اور استاذ مرحوم کیلئے بہترین صدقہ جاریہ ہیں۔

راقم الحروف نے دارالعلوم دیوبند کے دس سالہ زمانہ طالب علمی کے ابتداء ہی میں اپنے بعض اساتذہ کی زبانی جب رجیل موصوف کی علمی عظمتوں کے چرچے سنے تو ان کی دیدوزیارت کا اشتیاق دل میں گھر کر گیا، لیکن کافی دنوں تک ملاقات کی کوئی تقریب میسر نہ آسکی، حسن اتفاق کہ ان ہی دنوں نامور فقیہ ومحدث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ سے بغرض استفادہ مکاتبت ہوئی تو انہوں نے حضرتؒ سے ملنے کی تاکید بھی فرمادی، خاکسار خط لیکر آپ کی خدمت میں پہنچا دروازہ پر دستک دی تو فوراً ایک نورانی، وجیہ وشکیل اور بارعب وباوقار شخصیت نمودار ہوئی، مرکز نوائے قلم دیوبند کے بانی اور شہرت پذیر خاکہ نویس ابن الازہر مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے ان کے ظاہری خدوخال کی بالکل بجا تصویر کشی کی ہے لکھتے ہیں: ”درمیانہ قد، کشادہ پیشانی، آنکھوں میں علمی چمک لباس نہایت سادہ اجلا اور سفید، ہر موسم میں یہی لباس زیب تن کئے ہوئے، موسم کے اعتبار سے سر پر رومال ورنہ ہمیشہ دوپلی ٹوپی شیروانی اور کبھی کبھی جرسی، شدید سردی ہوتی تو جسم پر چادر بھی نظر آتی“

چنانچہ علیک سلیک اور مصافحہ کرتے ہی احقر نے اپنی آمد کی غرض وغایت بھی بیان کردی، مولانا زیر لب مسکرائے اور کچھ دیر گفتگو کے بعد واپس گھر میں چلے گئے، یہ

مولانا مرحوم سے پہلی ملاقات تھی لیکن ان یادگار لمحات کے حسین مناظر آج بھی نگاہ وقلب کیلئے باعث نضرت وفرحت ہیں، انہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ واقعی ہمارے اکابر واسلاف نادرۂ روزگار تھے، ان کا ظاہر وباطن تناقض سے پاک اور علم ومعرفت سے آراستہ تھا، ان کی زندگی کے رات ودن ماہ وسال سنت وشریعت کے احیاء اور فروغ میں صرف ہوتے تھے، ان کی خلوت وجلوت سفر وحضر اور نشست وبرخاست تعلیمات نبویؐ سے عبارت ہوا کرتی تھی، بے شک مولانا خورشید عالم صاحب بھی سلف صالحین کی بہترین یادگار تھے

دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات　　　　تھی سراپا دین ودنیا کا سبق تیری حیات

انسانوں کی انجمن کے اس فرشتہ صفت انسان میں فیاض ازل نے بے شمار خوبیاں رکھی تھیں وہ پاکیزہ اور روشن کردار کے حامل ایک خدارسیدہ عالم دین ومحدث تھے، زبان انتہائی صاف بولتے کیا بس موتی رولتے تھے، ان کے تلامذہ کا بیان ہے کہ مولانا شیریں زباں رکھتے تھے انداز تدریس لاجواب اور تفہیم ابحاث کا ملکہ بے مثال تھا، انہوں نے ابتداء سے لیکر انتہاء بخاری شریف تک تمام چھوٹی بڑی کتابیں سلیقہ سے پڑھائیں، دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم وقف کے علاوہ دارالعلوم کراچی پاکستان میں چار سال تک تدریسی خدمات انجام دیں، شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی کا شمار آپ کے تلامذہ میں ہوتا ہے علاوہ ازیں دارالعلوم کے موجودہ روح رواں حضرت مفتی ابوالقاسم نعمانی بنارسی آپ کے براہ راست شاگرد ہیں:

ان کے باغ علم کا ہر پھول ہی شاداب ہے

مولانا کا محبوب اور مرکزی کردار ومشغلہ اگرچہ تدریس رہا لیکن بعض اہل علم کی فرمائش واصرار پر قلمی میدان میں بھی اپنا علمی رنگ ماند نہ ہونے دیا، چنانچہ ترجمہ فتاوی

عبدالحی اور ترجمہ وتشریح ابوداؤدشریف آپ کے زنبیل قلم کا شاہ کار ہے۔

الغرض ۱۵/ذی قعدہ ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۶ء میں دیوبند کے مشہور عثمانی خاندان کے اندر حضرت مولانا ظہور احمد صاحب کے یہاں آنکھیں کھولنے والے حضرت مولانا خورشید عالم کی پوری ۷۲ رسالہ زندگی درس حدیث وتفسیر اور فقہ وفتاویٰ میں گذری اور اپنے مشہور عالم اساتذہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ اور حضرت مولانا نصیر احمد خانصاحبؒ وغیرہم کی دیرینہ علمی روایتوں کو پروان چڑھایا، جس کا اجر وصلہ ان شاء اللہ انہیں قیام قیامت تک ملتا رہے گا اور وہ بالیقین بارگاہ خداوندی میں دائمی سعادتوں سے بہرہ یاب ہورہے ہونگے

۔

بہرکیف اسی روز بعد نماز ظہر آپ کی نماز جناہ خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند وقومی نائب صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے احاطۂ مولسری میں پڑھائی جس میں بے شمار علماء صلحا فضلاء طلبہ اور عوام کا ایک جم غفیر تھا، بعد ازاں مزار قاسمی میں انہیں نم آنکھوں کے ساتھ یہ کہتے ہوئے منوں مٹی کے نیچے سلادیا کہ:

زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا　　تم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

اخیر میں یہ امر بھی باعث اطمینان وخوشی ہے کہ حضرت والا نے اپنے پسماندگان میں دیگر اولاد واحفاد کے علاوہ دوخوش بخت صاحبزادوں محترم مولانا محمد عارف عثمانی اور مولانا قاری محمد واصف عثمانی صاحبان کو بطور یادگار چھوڑا ہے ہر دو صاحبزادگان ماشاء اللہ دارالعلوم وقف دیوبند کے مقبول اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں امید ہے کہ آپ کے جانشین اپنے پدر بزرگوار کی علمی روایتوں کو زندہ رکھیں گے اور ان کیلئے قرۃ العین اور شادمانی کا ذریعہ بنے رہیں گے۔

(یہ مضمون ماہنامہ صدائے حق بابتہ ماہ فروری ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا)

اب انہیں ڈھونڈھ چراغ رخ زیبا لے کر

وکیل الاحناف حضرت مولانا ابوبکر غازی پوریؒ

لیجئے ملت اسلامیہ ابھی اپنے نامور سپوت ممتاز محدث وفقیہ اور مقبول مدرس مولانا مفتی خورشید عالم دیوبندی قدس سرہ کی جدائی پر اشک بارتھی کہ اگلے ہی دن وکیل الاحناف، بلند پایہ مصنف، عالم بے بدل، صاحب طرز ادیب اور انشاء پرداز حضرت مولانا ابوبکر غازی پوریؒ بھوپال کے ایک تبلیغی سفر سے واپس ہوتے ہوئے دہلی میں ۱۵ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ مطابق ۸ فروری ۲۰۱۲ء بوقت صبح صادق اپنی حیات مستعار کے ۶۷ برس پورے کر کے راہی ملک بقاء ہو گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

فروغ شمع تو باقی رہے گا صبح محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

مولانا غازی پوری بظاہر بالکل تندرست چاق وچوبند صحت منداور توانا نظر آتے تھے لیکن کسے معلوم تھا کہ وہ بہت جلد شہر خموشاں کے باسی ٹھہر جائیں گے، اللہ رب العزت بال بال مغفرت فرمائے اور پسماندگان وجملہ محبین کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی کرے آمین۔

حضرت مولانا ابوبکر غازی پوری کا سانحۂ رحلت کسی ایک گھر یا خاندان کا ذاتی حادثہ نہیں ہے بلکہ ہر اس شخص کیلئے صدمہ کی بات ہے جو فکری بے راہ روی سے دور صراط مستقیم پر چلتے ہوئے کل روز قیامت انبیا، صدیقین، شہداء صالحین ائمہ مجتہدین اور اللہ کے مقبول ومقرب بندوں کے ساتھ محشور ہونے کی دیرینہ آرزو رکھتا ہے۔

مولانا کے واقف کار بخوبی جانتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے اپنے قلم اور زبان

سے تن تنہا بڑے بڑے فتنوں کا تعاقب کیا اور جو کام کسی اکیڈمی یا ادارہ کے کرنے کا تھا اللہ پاک نے ان سے خوب لیا، جن کٹھن راہوں کا انتخاب انہوں نے کیا تھا وہ بڑی دشوار گذار تھیں لیکن ظفر مندی نے ان کے قدموں کو بوسہ دیا جس میں ان کے دینی جذبہ اور نصرت خداوندی کا خاص دخل تھا، احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ جس شان سے مولانا مرحوم ادا کرتے رہے اس کا اجر وصلہ ان شاء اللہ انہیں نصیب ہوتا رہے گا۔

دین پسند اور اہل علم حضرات کو معلوم ہے کہ مدت بسیار سے افراط وتفریط کے شکار بعض گمراہ فرقے بڑی شد ومد کے ساتھ مختلف ٹائٹلوں اور بظاہر خوب صورت عناوین کا سہارا لے کر اسلام کی اصل روح کو ختم کرنے اور سواد اعظم کو ملیا میٹ کرنا چاہتے ہیں، ادھر ایک عرصہ سے اس میں کچھ زیادہ ہی تیزی آئی ہے، اباحت پسندوں کی ٹولیاں فقہ حنفی کو جس طرح تختہ مشق بنانے پر تلی ہوئی ہیں اس سے علماء حق کا مشوش ہونا اور کسی مداہنت یا مجاملت (ڈپلومیسی) کی پرواہ کئے بغیر دفاعی واقدامی تدابیر کرنا ایک فطری بلکہ دینی ضرورت ہے، مولانا مرحوم اس باب میں کسی مفاہمت یا صلح مع الکل کے بالکل روادار نہ تھے، وہ فقہ حنفی کے طرف دار اور حق گوئی کے طرح دار تھے، وہ صحیح اور راسخ العقیدہ علماء کی طرح فقہ حنفی کو اقرب الی السنہ سمجھتے اور اس کے اثبات وایضاح میں قولاً وعملاً متحرک رہتے، کسی ادارہ یا جامعہ کا سہارا لئے بغیر غازی پور کے انتہائی پسماندہ علاقہ میں انہوں نے اپنے مسلک ومشرب کی صیانت واشاعت کا بابرکت آغاز کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مولانا کی خدمات کا دائرہ از عجم تا عرب پھیل گیا۔

انہوں نے متعدد مختلف فیہ مسائل پر کئی کتابیں تحریر کیں، مولانا عربی واردو پر یکساں قدرت رکھتے تھے، عربی زبان کے عبقری معلم اور مربی استاذ حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی شاگردی اور علمی صحبتوں نے انہیں کندن بنا دیا تھا، چنانچہ انہوں نے

اپنے وطن غازی پور سے ہی دوماہی رسالہ بنام ''زمزم'' بھی جاری کیا جبکہ صوت الاسلام سہ ماہی عربی میں نکالا آپ کے اس دینی اور علمی مجلہ زمزم نے باذوق قارئین کو خوب سیراب کیا، اس میں آپ ملک وبیرون ملک کے ایرادات کا جواب بھی مدلل ومحقق لکھتے، چنانچہ ارمغان حق نامی کتاب انہی سوالوں وجوابات سے مملوایک علمی دستاویز ہے جس سے مدیر کے استحضار علمی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس خاکسار پر بھی مولانا کی شفقت تھی ایک مرتبہ معروف سیرت نگار مولانا شبلی نعمانی کی شاہ کار تصنیف سیرت النعمان مطالعہ میں آئی تو مولانا نعمانی کی یہ بات فہم سے بالاتر رہی کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی حضرات صحابہ سے رؤیت سے بڑھ کر روایت کا اثبات کرنا حنفیت پر زیادتی کرنا ہے، بندہ نے شافی وافی جواب کے لئے مفسر قرآن مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلویؒ کو زحمت دی، ادھر سے جواب آیا کہ حضرت مولانا غازی پوری بہترین مداوا کرسکتے ہیں لہذاان سے رجوع کیا جائے، مراسلت ہوئی تو اندازہ ہوا کہ واقعی اللہ نے انہیں حنفیت کا وکیل اور ترجمان بنایا تھا۔

دارالعلوم دیوبند میں ان کی بارہا زیارت ہوئی پھر جب اشرف العلوم رشیدی گنگوہ میں خدمت تدریس کیلئے اس ناچیز کا انتخاب ہواتو مولانا بڑے خوش ہوئے، ماہنامہ صدائے حق کے تبادلہ میں اپنا دوماہی زمزم بھی جاری کیا، جامعہ کے مدیر ومحدث حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ مدظلہم کی علمی سرگرمیوں پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بولے کہ ارباب انتظام ایسے ہوں تو ماحول بھی علمی ہوتا ہے، مزید گویا ہوئے کہ میں گنگوہ حاضری کا ارادہ رکھتا ہوں، چنانچہ ابھی تین ماہ قبل مولانا اپنے مرکز عقیدت دیوبند تشریف لائے توفون کرکے اپنی گنگوہ آمد کی اطلاع دی اور جمعہ کے دن اپنے بعض رفقا کی معیت میں اشرف العلوم میں وارد ہوئے، خیر خیریت کے بعد استفسار کرنے پر بتلایا کہ میں

۴۲ رسال بعد آج گنگوہ آیا ہوں اور پہلی مرتبہ اس عظیم درسگاہ کا دیدار ہورہا ہے، حضرت ناظم صاحب حفظہ اللہ کی فرمائش پر جمعہ سے قبل مسجد زکریا میں خطاب بھی فرمایا، دوران تقریر آپ پر رقت طاری تھی جس سے سامعین بھی متاثر ہوئے، بڑی چشم کشا باتیں ارشاد فرمائی، بعدازاں ظہرانہ تناول فرما کر واپس دیوبند کے لئے رخصت ہو گئے، آخر کون جانتا تھا کہ حضرت مولانا غازی پوریؒ ایک نئے سفر کی تیاری پر ہیں جہاں کی مسافتیں ختم نہ ہونے والی ہیں مولانا کے انتقال سے گویا علمی مجلسیں بھی بے کیف سی ہوگئیں:

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لئے

ہمارے ممدوح خوش عقیدہ، خوش فکر اور خوش گفتار و خوش کردار تھے، مزاج میں نفاست بھی خوب تھی، اپنے کاموں کو بعجلت تمام روبہ عمل لانے کی دھن سوار رہتی، اللہ نے ظاہری و باطنی کمالات سے حظ وافر انہیں بخشا تھا، معمولات اور اوراد و وظائف کا اہتمام قابل رشک تھا، رات میں بہت جلد سونے کے عادی لیکن قیام اللیل اور سحر خیزی کا دائمی شوق اپنے اکابر و اسلاف رحمہم اللہ کی طرح انہیں بہت جلد بستر سے جدا کر دیتا، پابندی سے نماز تہجد ادا کرتے اور پھر تلاوت یا ذکر و تسبیحات میں کھو جاتے، زبان ذکر الٰہی سے تر رہتی، بعض مشاہدین کا بیان ہے کہ انتقال کے وقت بھی زبان پر اللہ اللہ کے کلمات جاری تھے کہ اسی درمیان اس مرد قلندر کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

بخش دے مولا ہمارے شیخ کی ہر چوک کو

ذکر میں زندہ رہا اور ذکر میں جاتا رہا

مولانا ابوبکر غازی پوری ابن مولیٰ بخش انصاری ۱۷ رشوال ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۵ رمارچ ۱۹۴۵ء کو غازی پور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مدرسہ دینیہ غازی پور میں حاصل کی، فارسی اور عربی تعلیم کے مراحل بالترتیب احیاء العلوم مبارک پور اور مدرسہ مفتاح

العلوم مئو میں طے ہوئے، دورۂ حدیث اور ادب عربی کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں باکمال وفخر روزگار اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی، بخاری شریف شیخ الحدیث حضرت مولانا فخرالدین مرادآبادی سے پڑھی، فراغت کے بعد مدرسہ دینیہ غازی پور سے تدریسی سفر شروع ہوا جو سلسلہ وار تعلیم الدین ڈابھیل، مظہرالعلوم بنارس، سبیل السلام حیدرآباد میں جاری رہا، اخیر میں اپنے وطن کے اندر مکتبۂ اثریہ کے نام ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا جہاں سے آپ کا قلمی جہاد آخری دم تک جاری رہا، آپ کی قابل رشک خدمات پر یہ شعر بجا طور پر صادق آتا ہے کہ:

مرکر بھی نہ ہوں گے رائیگاں ہم
بن جائیں گے گرد کارواں ہم

بالآخر ۱۵/ ۳/ ۱۴۳۳ھ کو ان کا جنازہ دہلی سے غازی پور لایا گیا ۱۶/ ربیع الاول کو قاری محمد انس حبیب قاسمی کی اقتداء میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور آبائی قبرستان کٹھولیا میں تدفین عمل میں آئی:

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

(یہ مضمون ماہنامہ صدائے حق بابتہ ماہ فروری ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا)

سلسلۂ تھانوی کے تاج دار

حضرت مولانا صفی اللہ خان جلال آبادیؒ

ادھر چند ماہ کے اندر اندر ہی قافلۂ علم وکمال کے جو مسند نشیں منزل فردوس کو سدھار گئے ان کی فہرست پر نظر ڈالیں تو یاس وحرماں نصیبی کے سبب کلیجہ منھ کو آتا ہے کہ اس دور قحط الرجال میں جن واصل باللہ شخصیات کا وجود بسا غنیمت تھا، وہ یکے بعد دیگرے رخصت پذیر ہیں، جن کے دمِ نفس سے رشد وہدایت اصلاح وارشاد اور تدریس وتبلیغ کے حلقے شاداب تھے وہ بے رونق ہوا چاہتے ہیں، فیوض وبرکات کا سیل رواں لگتا ہے کہ تھما چاہتا ہے اور محرومیاں دبے پاؤں چلی آرہی ہیں، اگر خدا نخواستہ عارفین وکاملین، کبار اولیاء اللہ دنیائے جہاں باقی کی طرف یونہی محو سفر رہے، دین ودانش کے چراغ گل ہوتے رہے، موتیوں کی لڑی کے دانے بکھرتے رہے تو پھر اس امت مرحومہ کی دست گیری کون کرے گا؟ ویسے تو یہ تمام فیصلے اللہ کے حکم اور اس کی مشیت کے تابع ہیں، قانون الٰہی کے اجراء ونفاذ میں کون دخیل ہوسکتا ہے، لیکن بظاہر جو حادثے ملت کو اشک بار کر رہے ہیں معلوم نہیں ان کی تلافی کیسے ممکن ہوسکے گی اور امت ابھی کتنے نشیب وفراز سے آشنا ہوگی، بس اللہ ہی کارساز ہے اور وہی کشتی کا حقیقی ناخدا ہے۔

۸ / ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ مطابق ۲ / مارچ ۲۰۱۲ء بروز جمعہ تھانوی سلسلہ کے قوی النسبت بزرگ خانقاہ مسیحیہ کے گدی نشین اور قدیم دینی وعلمی درسگاہ مفتاح العلوم جلال آباد کے رئیس الاہتمام حضرت مولانا صفی اللہ خاں عرف بھائی جان نے کیا آنکھیں موندیں، علم وعمل، حکمت وتدبر، فہم وفراست، تواضع وفنائیت اور فضل وکمال کی ایک

تاریخ نے آنکھیں موند لیں، بزم اشرف کے روشن چراغ مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خان جلال آبادیؒ نے اپنے قصبہ میں جن پاکیزہ روایتوں کی طرح ڈالی تھی، سلوک واحسان کا جو جادو جگایا تھا اور تعلیم وتربیت کے جو زمزمے بلند کئے تھے آپؒ کے اس دنیا سے پردہ کناں ہونے کے بعد آپ کے ولد صالح مرد دانا ودرویش حضرت بھائی جانؒ نے بساط بھر کوشش کر کے انہیں زندہ وتابندہ رکھنے کا فرض نبھایا اور ان کی مساعی جمیلہ برگ وبار بھی لائیں، بقول شیخ الاسلام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم ''اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان (حضرت بھائی جان) کے ذریعہ حضرت مسیح الامۃ قدس سرہ کے فیوض وبرکات کو جاری رکھا ہوا تھا، اور جلال آباد کا یہ مرکز فیض ان کے دم سے آباد تھا، ان کی رحلت موت العالِم موت العالَم کی مصداق ہے''۔

واقعی مولانا مرحوم کی ذات گرامی شجر سایہ دار کے مانند تھی، ان کے سایہ کی برکت سے ملت بہت سی تپشوں سے محفوظ تھی، وہ لائق باپ کے سعادت مند بیٹے تھے اور ان پر اپنے والد گرامی کی نسبتوں کا رنگ چڑھا ہوا تھا، ان کے چہرہ بشرے سے فنا فی اللہ کے آثار ہویدا تھے، جبکہ زبان ذکر اللہ کی تراوٹ سے آشنا رہتی، مبدأ فیض سے وہ بہت سی خصوصیات لیکر آئے تھے، خوش اخلاقی، خوش گفتاری، ہر ایک کے تئیں محب ومحبوب جو ان سے ملتا دوبارہ زیارت ودید کا اشتیاق اس کے دل میں گھر بنالیتا، واردین وزائرین کا ہمہ وقت خیال، اپنے بڑوں سے استفادہ، جبکہ چھوٹوں پر بے حد شفیق، گھریلو شاہی کروفر کے باوجود ذاتی زندگی بالکل سادہ مگر خودداری وقار اور عزت نفس کے باب میں کسی صلح کے بالکل روادار نہیں، ذکر وفکر اور یاد الٰہی میں کھو جانا ان کی طبیعت کا ناگزیر حصہ تھا، انہیں موقع ملتا تو وہ فوراً ذکر وتسبیحات یا پھر تلاوت کلام اللہ شریف میں ڈوب جاتے، حضرت والد گرامی کے حین حیات ہی وہ مختلف امور کار میں شریک رہنے لگے

تھے، اور ان کی با فیض مجلسوں میں کچھ پانے کے ارادہ سے پابندی سے شریک رہتے، مزید براں ابتدائی تعلیم کا حساس مرحلہ آپ کی نگرانی میں طے ہوا، آپ نے حضرت مسیح الامتؒ کی بہت خوبیوں کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا۔

حضرت بھائی جان نے ۱۹۴۰ء میں اس دنیاء آب وگل میں آنکھیں کھولی تو والد محترم کے فضل وکمال کی شہرت آفتاب نصف النہار پر تھی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسی کرشاتی شخصیت کے فیوض وبرکات سے پورا گھر جگمگا رہا تھا، لیکن اس مرد باصفا اور امام وقت نے ابھی تین سال گذرے تھے کہ اس فانی دنیا سے منھ موڑلیا اور ۱۹۴۳ء میں وہ جوار رحمت میں جا بسے، تغمدہ الله بغفرانہ۔

حضرت تھانویؒ کے منظور نظر رہے مولانا مسیح اللہ خان جلال آبادیؒ بالآخر بھاری بھرکم روحانی شخصیت بن کر ابھرے تو شمع تھانوی کے بھی بہت سے پروانے دیوانہ وار یہیں جمع ہوگئے اور بقدر ظرف اپنا دامن مراد بھرنے لگے، مولانا صفی اللہ اس خوشنما منظر سے بھلا کیوں متاثر نہ ہوتے، چنانچہ انہوں نے اپنے بڑوں کے نقش قدم پر نشان منزل کو تاڑلیا اور مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد میں عربی (عالمیت) کے کورس کی تکمیل پر توجہ دی، بالآخر ۱۳۷۸ھ میں دورۂ حدیث سے سند فراغ حاصل کی، بعد ازاں تدریسی میدان میں طبع آزمائی کی، جہاں مقبولیت وظفریابی نے انہیں سلام کیا، چنانچہ ابتدائی عربی کتب کے علاوہ کنز الدقائق جیسی کتابیں نہایت خوش اسلوبی سے آپ نے پڑھائیں، جس سے طلبہ کے مابین بھی قبولیت کا سکہ بیٹھ گیا، درس وتدریس کا سلسلہ ایک عرصہ تک برقرار رہا پھر ۱۳۹۷ھ میں اپنے والد گرامی کے شریک کار ہوگئے اور باضابطہ مہتمم مقرر کیے گئے، انتظام وانصرام میں گیرائی وگہرائی اللہ نے انہیں بخشی تھی، وہ حکمت سے کام لینے میں زیادہ بہترائی سمجھتے تھے اور فرماتے کہ بھائی حکمت سے کام کرنا چاہئے حکومت بھی اسی سے زندہ

رہتی ہے، اپنے ماتحتوں کے بارے میں وہ کان سے زیادہ آنکھوں پر بھروسہ کرتے تھے، انہیں یہ بھی فرماتے ہوئے سنا گیا کہ بھائی افراد کی قدر کرنی چاہئے وہ اگر ضائع ہوجائیں تو معلوم نہیں کہ نیا آدمی ان سے بہتر ثابت ہوگا کہ نہیں؟۔

مولانا صفی اللہ عرف بھائی جان انتظام واہتمام میں اپنے ابا جان کے نہ صرف شانہ بشانہ چلتے رہے بلکہ تصوف وسلوک کی وادیوں کی بھی سیر کرتے رہے، حتیٰ کہ حضرت والدگرامی نے اپنے فرزند میں آثار صالحیت وصلاحیت دیکھ کر ۱۴۱۲ھ میں اجازت بیعت سے سرفراز فرمایا، حضرت والدؒ کے بعد آپ اس عظیم خانقاہ کے مسند نشیں قرار پائے اور اللہ اللہ کی ضربوں سے یہاں کے در و دیوار کو مہکاتے رہے، بیعت وارشاد کا سلسلہ برابر جاری رہا، تقریبا بارہ افراد کو آپ نے اجازت بیعت وخلافت سے نوازآپ کا فیضان ماشاءاللہ دور دور تک پہنچا اور بالآخر مردہ دلوں میں ایمانی روح پھونکنے کے بعد اپنی حیات آفریں خدمات کا صلہ پانے کی خاطر ہمیشہ کیلئے حضرت بھائی جانؒ اپنے رب کے حضور پہنچ گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

شگفتہ بیان مقرر وخطیب

حضرت مولانا محمد اسلم صاحب مظاہریؒ

اس جہان فانی دنیا میں حضرت انسان کی آمد ورفت کا سلسلہ گردش شام وسحر کے ساتھ جاری ہے، معلوم نہیں آن واحد میں کتنے نفوس اس عالم رنگ وبو میں آکر اپنی مقرر کردہ ساعتیں گذار کر اس طرح رخصت ہوجاتے ہیں کہ کانوں کان نہ اس کی کوئی خبر مسموع ہوتی ہے اور نہ ان کے جانے کا کسی کو کوئی صدمہ واحساس ہوتا، موت وحیات کا یہ تماشہ ہر روز وشب مشاہد ہوتا رہتا ہے، لیکن بعض شخصیات اپنی روشن خدمات اور قابل رشک خوبیوں کے سبب محبوبیت ومقبولیت کا ایسا روپ دھار لیتی ہیں کہ اگر وہ اچانک ہم سے روٹھ جائیں تو ان کی جدائیگی کا احساس پوری ملت کو اشک بار کردیتا ہے، لوگ بلک کر رہ جاتے ہیں اور زمانہ انہیں یاد کرتا رہتا ہے، ۹؍ رجمادی الاول ۱۴۳۳ھ مطابق ۲؍ مارچ ۲۰۱۲ء بروز پیر کو اذان فجر کے معا بعد مدرسہ کاشف العلوم چھٹمل پور کے موقر استاذ حدیث جناب مولانا محمد حبیب اللہ قاسمی نے جب اس خاکسار کو فون کرکے بتایا کہ رات حضرت مولانا محمد اسلم صاحب اللہ کے جوار میں چلے گئے تو بے حد صدمہ ہوا اور دل نے فوراً گواہی دی کہ آہ بزم مظفر کا یہ روشن چراغ بھی گل ہوگیا:

لو آج وہ بھی خادم قوم وملت رخصت ہوا
روشنی پاتی تھی جس سے بزم عرفاں اٹھ گیا

مولانا محمد اسلم صاحب ضلع سہارنپور کے قصبہ مرزاپور پول میں ایک خدا رسیدہ بزرگ مولانا عبدالمجید صاحبؒ کے نور نظر تھے جو ۲۱؍ دسمبر ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی

تعلیم وتربیت مقامی ادارہ مدرسہ فیضان رحیمی میں ہوئی، عربی وفارسی کی تحصیل کیلئے جامعہ کاشف العلوم چھٹمل پور کا رخ کیا، جہاں آپ کی خوابیدہ صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئیں، ذہانت وفطانت کے دریچے واہوئے، تاآں کہ وہ اپنے اساتذہ کی نگاہوں میں چڑھ گئے، پھر یہاں کے علمی ماحول نے انہیں ایشیاء کی دوسری بڑی قابل احترام درسگاہ جامعہ مظاہر علوم سہارنپور پہنچادیا، جہاں علم وعمل کے آفتاب وماہتاب اپنی کرنیں بکھیر رہے تھے، کبار محدثین اپنی اپنی مجلسیں سجائے بیٹھے تھے اور اقطاع عالم سے تشنہ کامان علم وادب یہاں آکر اپنا دامن مراد بھر کر لوٹ رہے تھے، چنانچہ مولانا محمد اسلم صاحبؒ نے بھی اساتذہ عظام سے کسب فیض کیا اور ان کے ذریعہ عطا کردہ امانت ”تبلیغ دین“ کا پاکیزہ جذبہ لے کر وطن لوٹے ہی تھے کہ جامعہ کاشف العلوم کی ہوش مند انتظامیہ نے برائے تدریس آپ کا تقرر فرمالیا، یہاں آپ کی درسی استعداد نکھر کر سامنے آئی، چنانچہ علوم وفنون کی اکثر چھوٹی بڑی کتب آپ سے متعلق رہیں اور خوش اسلوبی سے آپ تدریسی فرائض سرانجام دیتے رہے، تدریس کے ساتھ ساتھ انتظامی صلاحیتیں بھی علیٰ وجہ الاتم موجود تھیں چنانچہ حضرت مولانا شریف احمدؒ کی وفات کے بعد باتفاق رائے منصب اہتمام آپ کے حوالہ کردیا اور ۱۳۹۹ھ سے انتظامی طور پر بھی آپ سرگرم عمل ہوگئے اور زندگی کے آخری پڑاؤ تک آپ مدرسہ کاشف العلوم کی تعلیمی وتعمیری توسیع وکشادگی کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہے، ادارہ کی ترقی کے لئے مولانا نے ملک وبیرون ملک کے اسفار بھی کئے اور اس کی ظاہری وباطنی ترقیات کیلئے فقید المثال کوششیں سرانجام دیں، بحمداللہ آج مدرسہ کاشف العلوم عزت ووقعت کے لحاظ سے قابل قدر اداروں میں گنا جاتا ہے اور اس کے فیض یافتگان ملک وبیرون ملک میں اپنی مادر علمی کا نام روشن کر رہے ہیں۔

حضرت مولانا محمد اسلم صاحبؒ بے شمار خوبیوں کے مالک تھے، نہایت خوش

اخلاق، کریم النفس اور بے مثال مہمان نواز تھے، ان کی کشادہ دستی کے سبھی معترف تھے، سادگی وقناعت پسندی، رضا بالقضا کا عملی مشاہدہ مولانا مرحوم کے یہاں خوب ہوا، واقعی حضرتؒ مجمع الکمالات تھے، تقریباً تین دہائیوں پر مشتمل کاشف العلوم کا ان کا دور اہتمام بھی مثالی رہا، موصوف کی حیات وخدمات کا ہر پہلو روشن ہے، بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ:

سفینہ چاہئے اس بحر بے کراں کیلئے

یاد پڑتا ہے کہ مولانا کی اولین زیارت اپنی پہلی مادر علمی مدرسہ عزیز القرآن کھجناور میں زمانۂ حفظ میں ہوئی، حضرت مولانا کچھ دیر کے لئے وہاں ٹھہرے تھے اور مدرسہ کے معتمد جناب ڈاکٹر سید منظور احمد قاسمی زید مجدہ ہم سے بچوں کی تعلیم وتربیت سے متعلق گفتگو بھی فرمائی تھی، کم سنی کی وجہ سے ہم جیسے بچے ان کی باتیں مکمل کیا سمجھ پاتے لیکن یہ اندازہ ضرور ہوا کہ وہ تعلیم وتربیت کے حوالہ سے نہایت حساس ہیں اور آیا مدارس کے لئے یہ تربیتی امور کس قدر ناگزیر ہیں؟۔

بندہ عربی وفارسی اور تجوید کی تعلیم کیلئے دارالعلوم دیوبند آگیا، آمدورفت چوں کہ براہ چھٹمل پور ہوتی تھی اس لئے ان سے ملاقات کے مواقع بھی میسر آئے، جب بھی حاضر ہوتا تو قدر کی نگاہ سے دیکھتے، ایک مرتبہ مولانا نے ماضی میں امریکہ کی مطلوب ترین شخصیت رہے اسامہ بن لادن کے بارے میں کوئی محتاط تبصرہ کردیا لیکن بدخواہوں نے اسے دوسرا رنگ دینے کی کوشش کی، راقم بھی حقائق جاننے کیلئے خدمت میں حاضر ہوگیا، بالمشافہ ملاقات پر مولانا نے جو مبنی برحقیقت باتیں بتلائی اس سے معلوم ہوا کہ اخبارات نے حسب عادت بیان کو توڑ مروڑ کر پیش کیا تھا لیکن بہرحال وہ ان جیسے نازک مسائل سے بھی نمٹنے کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے، چنانچہ اخبارات کا پیدا کردہ یہ قضیہ نا مرضیہ بہت جلد ختم ہوگیا۔

مبدأ فیاض نے انہیں بے شمار خوبیوں سے مالا مال کیا تھا، چنانچہ زبان وبیان کا

اللہ نے آپ کو وہی ذوق بخشا تھا، آپ کے بیانات علم وحکمت سے بھرپور ہوا کرتے تھے، قرآن کریم کی آیتیں برمحل استعمال کرتے، روایات قصص اور تمثیل واقعات سے اپنے بیان کو مدلل ودلنشیں بنادیتے، ہزاروں کے مجمع میں بھی ان کا جادوئی بیان اپنی انفرادیت کے پیکر تراش لیتا، سامعین اس طرح گوش برآواز رہتے لگتا کہ ان ہی کے دل کی باتیں ہو رہی ہیں یا ان پر سحر کردیا گیا ہے:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے　　　پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

آپ کے ان فیض رساں خطبات کو اس قدر قبولیت و پذیرائی ملی کہ آج ''خطبات اسلم'' کی شکل میں موجود اس علمی متاع گرانمایہ سے اصحاب منبر ومحراب حسب بساط مستفید ہو رہے ہیں اور حضرت مولانا کی روح کو ٹھنڈک پہنچا رہے ہیں، اللھم زد فزد۔

تعلیم وتدریس اور نظم وانتظام کے ساتھ سلوک واحسان کی راہوں کا بھی آپ نے کامیاب سفر کیا، انجذاب الی اللہ اور تزکیہ قلب وجگر کی بے چینی نے درویش زماں فقیہ اسلام حضرت مولانا مفتی مظفر حسین اجراڑوی علیہ الرحمہ سابق ناظم مظاہر علوم سہارنپور کے دست حق پرست پر بیعت کرادیا، جہاں تشنہ کامان علم ومعرفت کا ہجوم رہتا تھا اور وہ یہاں کے خوان معرفت سے ریزہ چینی کر کے مردوں کی مسیحائی کا خوش گوار فریضہ ادا کرتے اور گم کردہ راہوں کو نشان منزل کا پتہ دیتے، شیخ مظفرؒ جیسا مرشد باصفا اپنے اس چہیتے مرید کو بھلا کیوں کر محروم کرتا، چنانچہ صلاح واستعداد کے عناصر ترکیبی دیکھ کر بہت جلد خرقہ خلافت سے آپ کو نوازا گیا، حضرت مرحوم کا بھی اپنے شیخ سے یہ تعلق برابر قائم رہا ان کی ہدایت ومشوروں کے مطابق آپ تبلیغ دین ومعرفت میں لگے رہے اور اصلاح نفوس کا جوکھم بھرا کام کرتے رہے، آپ کی عرفانی مجلس بھی ہوا کرتی جس میں زور زبردستی کئے بغیر بندگان خدا برضا ورغبت حاضری دیتے اور ذکر وفکر کی تراوٹ سے قلب وزبان کو

آشان کرتے ، افسوس کہ اب ایسی بابرکت اور بافیض خالص روحانی مجلسیں عنقا ہورہی ہیں اور جو بادہ کش پرانے تھے وہ اب رخصت پذیر ہیں۔

یہ بھی حضرت کے اخلاص کی دلیل ہے کہ انہوں نے کاشفی شمن کو اپنے خون جگر سے سینچا اور تشنۂ تکمیل بہت سے شعبوں کو مکمل کیا، امسال ہی اپنے یہاں دورۂ حدیث کا آغاز اس شان سے کرایا کہ دارالعلوم دیوبند و مظاہر علوم سہارنپور سمیت سرکردہ دینی اداروں کے سربراہان ووابستگان کو موقع کی مناسبت سے منعقد ہوئی اس بزم میں شرکت کی دعوت دی، احقر (جو اس تقریب میں اپنے ایک محترم کی معیت میں مدیر اشرف العلوم رشیدی گنگوہ کا تہنیتی پیغام لیکر حاضر ہوا تھا) نے دیکھا کہ بعض اہم شخصیات اس علمی محفل کی رونق بڑھا رہی تھیں جو یقینا حضرت مرحوم کی کشش اور ان کی مساعی جمیلہ کی برکت تھی۔

حضرت مولانا رسم وراہ خوب نبھاتے اور کسی بھی طرح دلوں کو صاف رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے، اسی وجہ سے آپ کے سانحۂ وفات کے بعد کش مکش یا اضطراب کی کیفیت دیکھنے یا سننے کو نہیں ملی، بلکہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ مجلس شوریٰ کی تجویز پر منصب اہتمام کے جملہ اختیارات جامعہ کے نائب مہتمم اور محدث حضرت مولانا محمد ہاشم قاسمی زید مجدہم کی طرف منتقل ہو گئے، اللہ کرے یہ حسن انتخاب ادارہ کیلئے بہر نوع مفید سے مفید تر ہو، آپ کی قیادت میں علم وعمل کا یہ قافلہ رواں دواں رہے، حضرتؒ کے فرزند والا صفات جناب مولانا محمد آصف قاسمی ندوی زید احترامہ مخلصانہ طور پر ان کے شریک کار رہیں اور کل روز قیامت یہ کاشفی چمن ان کے حق میں گواہ رہے، آمین۔

ایک چراغ اور بجھا

حضرت مولانا محمد مصطفیٰ بھیسانویؒ

گذشتہ ۲۷ر جمادی الاول ۱۴۳۳ھ مطابق ۱۹ر اپریل ۲۰۱۲ء بروز جمعرات کوظہر وعصر کے مابین جناب قاری محمد راشد شمس پوری کا فون آیا کہ: ابھی مصدقہ خبر آئی ہے کہ مولانا محمد مصطفیٰ بھیسانوی ایک دردناک سڑک حادثہ میں جائے وقوع پر ہی واصل بحق ہوگئے، یہ الم ناک اطلاع گوش برآواز ہوتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ زمین پاؤں تلے سے کھسک گئی ہو، لیکن زبان پر قابو رکھتے ہوئے فوراً استرجاعی کلمات ادا کئے او رفرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق انہیں ایصال ثواب کرنے سے بھی غافل نہ رہا، اب مکرر بھی یہی دعا ہے کہ اللہ رب العزت آپ کی مغفرت کاملہ فرمائے اور جملہ پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق اوران کا بدرجہا بہتر متبادل مہیا فرمائے آمین۔

مولانا محمد مصطفیٰ صاحبؒ علاقہ کے مقبول ومتعارف علماء میں شمار ہوتے تھے اور اپنے نامور والد گرامی شیخ الحدیث حضرت علامہ محمد رفیق صاحبؒ سابق محدث مفتاح العلوم جلال آباد ثم مظاہر علوم وقف سہارنپور کی یادگار تھے، اہل علم اور واقف کار بخوبی جانتے ہیں کہ تھانہ بھون کے قریب انتہائی پسماندہ اور بالکل گم نام چھوٹی سی بستی ’’بھیسانی اسلام پور‘‘ کی خاک سے اٹھے حضرت علامہ محمد رفیق قاسمیؒ کا علمی استحضار ودبدبہ کیا مسلّمہ شان رکھتا تھا اور تحقیقات وتنقیحات کے امین ان کے گرویدہ تھے، واضح ہو کہ عصر حاضر میں برصغیر کے مختلف دینی وملی اداروں کی قیادت کررہے دوانتہائی محترم نام شارح بخاری حضرت مولانا سلیم اللہ خان صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان اور حضرت مولانا سید محمد

رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ یہ اکابر دارالعلوم دیوبند میں آپ کے ہم سبق رہے ہیں۔

مولانا محمد مصطفیؒ نے حضرت علامہ محمد رفیق صاحبؒ کے یہاں ۱۶/اپریل ۱۹۵۹ء میں آنکھیں کھولی تو گھر کو دین ودانش کا گہوارہ پایا، چنانچہ ابتدائی تعلیم وتربیت یہیں مکتب میں حاصل کی بعدازاں دارالعلوم میرٹھ کیلئے رخت سفر باندھا جہاں حضرت والد گرامی کی نسبتوں کا بے حد لحاظ واحترام تھا، یہاں آپ نے عالمیت (درس نظامی) کا کورس پورا کیا اور بساط بھر کوشش کر کے خود کو زیور علم وادب سے آراستہ کیا، عربی زبان وادب سے دلچسپی اور مزید حصول استعداد کے صالح جذبہ نے یاری کی تو ندوۃ العلماء لکھنؤ کے لئے نکل پڑے جہاں کے ادبی ماحول میں دو سال رہ کر خوشہ چینی کی اور تکمیل ادب کر کے اپنے بزرگوں اور اساتذہ کی عطا کردہ امانت ''علم دین'' کی تبلیغ واشاعت کے مقدس فریضہ کی ادائیگی کے لئے ہمت مرداں لے کر وطن لوٹ آئے، اور وہیں میدان عمل میں کود پڑے۔

مشہور ہے کہ عزت وشہرت اسی کے قدم چومتی ہے جو وطن سے دور رہ کر کوہ کنی کرے اور وہاں کے مدوجزر کو برداشت کرنے کی صلابت وپختگی اس کے حوصلوں سے ہم عناں ہو، لیکن حضرت مرحوم نے اس نظریہ سے صد فیصد اتفاق نہیں کیا اور اپنے عمل سے اس کی تغلیط کرتے ہوئے ثابت کیا کہ وطن میں رہ کر بھی مادی ومعنوی ترقیات کے زینے طے ہو سکتے ہیں، چنانچہ آپ نے اپنے بڑوں کے مشورہ سے مدرسہ مصباح العلوم رفیقیہ کی داغ بیل ڈالی، جس نے ظلمت وجہالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں قندیل رہبانی کا کام کیا، ناخواندگی وپسماندگی کی سیاہیاں کافور ہونے لگی، ابتدائی سطح پر تعلیم وتعلم کے حلقے منعقد ہونے لگے، مضافات اور قرب وجوار کے طلبائے دین اس میخانہ میں بادہ خواری

کرنے لگے اور مولانا کی کوششوں کو احترام وعزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا، ہم جیسے ان کے چھوٹے بھی بلکہ بہت چھوٹے ان کے نام اور کام سے واقف ہوتے رہتے لیکن رسم وراہ کبھی نہ ہوئی، وہاں بالواسطہ عزیزداری کے باوجود ایک مرتبہ سے زیادہ جانا بھی یاد نہیں ہے، البتہ ایک مرتبہ دیوبند کے مضافاتی گاؤں نونابڑی میں برادر گرامی قاری عبدالسبحان صاحب کے مدرسہ قاسم العلوم انوریہ میں ان کا دلچسپ بیان سننے کا ضرور موقع ملا جہاں مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے بھی متعدد مقرر علماء رونق اسٹیج تھے۔

ابھی گذشتہ تقریباً دو ماہ قبل مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خان جلال آبادیؒ کے جانشین اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے روحانی سلسلہ کے پیشوا حضرت مولانا صفی اللہ خان عرف بھائی جان کے ۸ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ مطابق ۲ مارچ ۲۰۱۲ء بروز جمعہ کو سانحۂ وفات کے اگلے روز حضرت مدیر جامعہ اشرف العلوم رشیدی کی ہمرکابی میں بسلسلۂ تعزیت جلال آباد جانا ہوا تو بعد نماز عصر حضرت جلال آبادی کی مسند کے قریب بیٹھے مولانا مصطفیٰؒ کو دیکھا جو ان کے صاحبزادگان سے تعزیت فرما رہے ہیں، تسلی کے کلمات سنا رہے ہیں اور اپنائیت کا اظہار کر رہے ہیں، ناچیز ان کی یہ قابل رشک ادائیں دیکھتا رہا اور ان کا یہ عمل ان کی تصویر کے ساتھ میرے خانۂ خیال میں مرتسم ہوتا چلا گیا، لگتا تھا کہ وہ اپنے گھر کے افراد کو تسلی دے رہے ہیں۔

بہرکیف تعزیت مسنونہ پیش کر کے باہر نکلے تو احقر کو مخاطب کر کے حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ صاحب مدظلہم سوالیہ انداز میں فرمانے لگے! جانتے ہو یہ کون بزرگ ہیں؟ بندہ نے سکوت اختیار کیا تو فرمایا! یہ حضرت علامہ محمد رفیق بھیسانوی کے فرزند سعید مولانا محمد مصطفی صاحب ہیں، بڑے خوش اخلاق خوش مزاج، خوش گفتار اور خوش کردار ہیں، ہماری ان سے جلسوں میں ملاقات رہی ہے، علاقے کے مقبول مقرروں میں جانے

جاتے ہیں ، واقعی اب معلوم ہوا کہ مولانا مرحوم کثیر الاسفار تھے ،مغربی یوپی کے اکثر جلسوں میں ان کی شرکت لازمی سی سمجھی جاتی اور وہ بھی ہر ممکن کوشش کر کے سامعین اور منتظمین کے دلوں کو میلا نہ ہونے دیتے اورتھوڑی ہی دیر کیلئے سہی وہاں حاضری کواپنی سعادت تصور کرتے ، انتقال کے روزبھی وہ میرٹھ کے کسی گاؤں میں نکاح پڑھا کرایک دوسرے جلسہ میں پہنچنے کیلئے پرعزم تھے کہ حادثہ کاشکار ہوگئے۔

آخر کسے معلوم تھا کہ دوماہ کی صبح وشام کی گردش کے بعدوہ بھی حضرت بھائی جانؒ کے ساتھ رخصت پذیر قافلہ کا حصہ بن جائیں گے،آج جب یہ بے ربط چندتاثراتی سطور قلم بند کرنے بیٹھا ہوں تو مولانا مرحوم کی وہ ادائیں نگاہوں کے سامنے کھڑی خون کے آنسو رُلا رہی ہیں،ان کی کشادہ پیشانی، چہرہ کی مسکراہٹیں، ہونٹوں پرتبسم،آنکھوں سے ذکاوت وفہم کی جگمگاہٹ اورر سیلی گفتگو، زبان وبیان کی نستعلیقیت ،مخاطب کے من کوموہ لینے والی بھر پورترکیب ان کی یادوں کے ساز چھیڑ رہی ہیں، اور یہ مست قلندر اپنے قائم کردہ مدرسہ کے پہلو میں اب ہمیشہ کے لئے آسودۂ خاک ہے:

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ وہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(بشکریہ: ماہنامہ حرا کا پیغام/شمارہ: مئی، جون ۲۰۱۲ء)

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اصغر صاحبؒ

اس سرائے فانی دنیا سے کاروانِ دین ودانش کے جوگدی نشین منزل فردوس کو سدھارے ان کے خلا کی بھرپائی کا سامان بھی فراہم نہ ہوا تھا کہ ۱۲؍ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۵؍ جنوری ۲۰۱۳ء بروز جمعرات ممتاز دینی درسگاہ جامعہ اسلامیہ ریڑھی تاجپورہ کے شیخ الحدیث اور بزرگ عالم دین حضرت مولانا محمد اصغر صاحبؒ اپنی حیات بابرکت کی زائد از نوے بہاریں دیکھ کر مستجاب دینی خدمات کا صلہ پانے کی خاطر جوار رحمت میں پہنچ گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون، تغمدہ اللہ بغفرانہ وادخلہ فسیح جناتہ فانہ سمیع قریب مجیب۔

مولانا مرحوم کے سانحۂ رحلت سے محسوس ہوا کہ علم وادب کا ایک روشن چراغ گل ہوگیا، ایک ایسا چراغ جس سے علم وعمل کی بہت سی بستیاں روشن تھیں، اور اس کی حرارت آمیز کرنوں سے بیشمار قلوب جگمگا رہے تھے۔ رحیل مغفوران قدسی صفات کی حامل برگزیدہ شخصیات کی حسین یادگار تھے جن کے کردار وعمل کے پاکیزہ نقوش گہرے بھی ہیں اور دیرپا بھی، ان کے قول وعمل کی یکسانیت کے لازوال کردار تے ایسے افکار ونظریات کو وجود بخشا جن کی افادیت زمان ومکان کی حدود سے پرے ہے۔ ان کی زندگی کے شب وروز بالکل اس آئینہ کے مانند تھے جہاں گفتار نہیں کردار کے سکے ڈھلتے نظر آتے اور صدق وصفا کے نغموں سے کان بھی مانوس رہتے۔ ان کی خلوت اور جلوت میں جمال محمدی کا عکس جھلکتا ''وہ درکفِ جامِ شریعت درکفِ سندان عشق'' کی حقیقی تصویر دکھائی دیتے،

ان کی ہر بات پتھر کی لکیر ہوتی اور ہر ادا دربار محمدی سے مستعار۔ انہیں گراں مایہ اوصاف نے ہمارے سلف صالحین کو زندۂ جاوید بنا دیا تھا آج اگر ان کے نام اور کام کی خوشبو مشام جاں کو معطر کر رہی ہیں تو اس میں نہ حیرت کی بات ہے اور نہ استعجاب کا کوئی پہلو۔

آج اگر قوم وملت اپنے اس محسن کے حادثہ پر اشک بار ہے، دین وادب کے حلقے اگر یتیمی کے داغ سے رنجور ہیں تو صرف اسی لئے کہ ایسی نورانی ودلنواز عبقری ہستیاں اس دور قحط الرجال میں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں ع

ڈھونڈھوں گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

مولانا محمد اصغر نے ۲۱ر شعبان المعظم ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰ر اپریل ۱۹۲۱ء کو موضع مجاہد پور شیخو پور مظفر آباد ضلع سہارنپور یوپی کے ایک متوسط گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم وتربیت وطن مالوف ہی میں رہ کر ہوئی۔ قسمت نے یاری کی تو مدرسہ تعلیم القرآن (موجودہ جامعہ اسلامیہ) ریڑھی تاجپورہ جا پہنچے وہاں آپنے حفظ کلام اللہ شریف، تجوید، پرائمری سے عربی، فارسی درجہ متوسط تک تحصیل علم کا مرحلہ باحسن اسلوب طے کیا، یہاں آپ کے ذہن وفکر کے دریچے مزید وا ہوئے تو اعلیٰ تعلیم کیلئے دارالعلوم دیوبند کا رخت سفر باندھا جہاں اصحاب فضل وکمال کا بسیرا تھا اور چہار دانگ عالم میں دارالعلوم کا طوطی بول رہا تھا یہاں کی عمدہ تعلیم وتربیت کے چرچے زبان زد خاص وعام تھے اور اقطاع عالم سے تشنہ کامانِ علم وفکر یہاں آکر اپنا دامن مراد بھر رہے تھے۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے بھی بقدر ظرف ووسعت یہاں کے باکمال اساتذہ ومحدثین عظام کے خوان یغما سے ریزہ چینی کی اور ان کی سنت وشریعت سے عبارت پاکیزہ زندگی کے قابل قبول اوصاف کو اپنا لینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، آپنے جن اکابر اہل علم سے شرف تلمذ حاصل کیا ان میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الادب حضرت

مولانا اعزاز علی امروہوی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی، امام المنقول والمعقول حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی اور حضرت مولانا جلیل احمد کیرانوی جیسے نادرۂ روزگار اساطین علم وفضل سرفہرست ہیں۔

مادر علمی دارالعلوم دیوبند کا یہ قابل فخر سپوت اپنے اسلاف کی گراں بہا امانت کی تبلیغ واشاعت کا صالح جذبہ لے کر میدان عمل میں کود پڑا اور ۱۳۶۱ھ میں بحیثیت مدرس عربی جامعہ اسلامیہ ریڑھی میں وہاں کی ہوش مند انتظامیہ نے آپ کا تقرر کر کے آپ کی صلاح وصالحیت پر مہر تصدیق ثبت کردی، یہاں آپنے اثناء تدریس تمام درسی کتب پڑھائیں اور ۱۴۰۳ھ میں منصب شیخ الحدیث پر متمکن ہوئے، بخاری شریف کی تدریس مدارس اسلامیہ میں ترقیات کی آخری معراج ہے جو آپ کے حصہ میں بھی آئی اور آپ اپنے پیش رو اکابر کے طرز پر بخاری شریف کا سبق نہایت ہی وقار اور عالمانہ طرز پر ۱۴۳۲ھ تک بحسن وخوبی دیتے رہے۔لیکن عمر طبعی کے تقاضوں اور امراض وعوارض نے بالآخر اس مرد صالح کو تدریسی سلسلہ کے انقطاع پر بادل ناخواستہ مجبور کر دیا۔ چنانچہ ادھر آپ پندرہ ماہ سے زائد عرصہ سے علی شرف الرحیل تھے، علاج ومعالجہ کیلئے دہلی بھی لیجایا گیا مگر جاں بر نہ ہو سکے اور آخرش جان جان آفریں کے حوالہ کر دی۔ ع

جان ہی دیدی جگر نے آج کوئے یار پر
عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا

مولانا مرحوم ارادی طور پر شہرت وخودنمائی سے بھی کوسوں دور تھے اور اخفائے حال کے اس دستور پر عمل پیرا تھے جو انہیں اپنے بزرگوں سے بطور وراثت ملا تھا لیکن اس کے باوصف ان کے تبحر علمی اور رسوخ فی العلم کے تذکروں سے قرب وجوار کے ممتاز مدارس ہی کیا بلکہ دور دراز کے اوساط علم وادب بھی ناآشنا نہیں تھے۔ احقر راقم الحروف

جس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں متوسطات کا طالب علم تھا تو ان کی صلاح وصلاحیت کے خوش تذکرے خوب سنے اور آپ کی زیارت وملاقات کا اشتیاق بھی ہوا تاہم آپ کے فرزند ارجمند اور ہفت روزہ الجمعیۃ کے مدیر مولانا محمد سالم جامعی سے رسم وراہ کے علی الرغم یہ دیرینہ تمنا مقدر نہ ہوسکی وکان امر اللہ قدراً مقدوراً۔ ع

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

آج جب ان کے تعلق سے یہ چند سطریں ماہنامہ ''صدائے حق'' گنگوہ کے لئے زیب قرطاس کرنے بیٹھا ہوں تو ان کے تصور ہی سے آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی ہیں کہ اے اللہ یہ کیسے مخلص لوگ تھے ان کی استقامت پر ہزاروں کرامتیں قربان، دین وملت کے لئے ایسے بے لوث خدمت گار انسان اب رفتہ رفتہ سفر آخرت پر جارہے ہیں، نمائشی اور قوت فکر وعمل سے عاری بے ہمت لوگ غیر استحقاقی طور پر حصول مناصب کے لئے باہم دست وگریباں نظر آتے ہیں تو مولانا محمد اصغر جیسے دھن کے پکے اور لگن کے سچے بزرگوں کے داغ مفارقت کا احساس خون کے آنسوں رونے پر مجبور کردیتا ہے۔ اللہ کرے حضرت مرحوم اپنے قابل رشک کارناموں واوصاف وکمالات کے سبب جنات نعیم میں خوش وخرم ہوں آمین۔ (یہ مضمون ماہنامہ صدائے حق بابتہ ماہ مارچ، اپریل ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا)

گوہرِ شب چراغ تھے

حضرت مولانا عبداللہ محمد الحسنی ندوی

دینی، علمی اور دعوتی حلقوں کو یہ جانکاہ اطلاع اس وقت اشک بار کرگئی جب ۱۷ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ مطابق ۳۰ جنوری ۲۰۱۳ء کو معروف عالم دین اور عظیم مبلغ حضرت مولانا محمد عبداللہ الحسنی ندوی گلشن حیات سے اپنا رشتہ منقطع کرکے وہاں چلے گئے جہاں سبھی کا آخری پڑاؤ ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا عبداللہ الحسنی ضلع رائے بریلی کے تکیہ کلاں میدان پور میں شہرت پذیر اس تقدس مآب سادات خانوادے کے گوہر شب چراغ تھے جن کے در و بام سے علم و عمل اور اصلاح و انقلاب کی شمع فروزاں ہوتی رہی ہے اور ملت اسلامیہ ہندیہ کو علم و حکمت کے انمول موتی ملتے رہے ہیں، وہ اس طلائی زنجیر کی کڑی تھے جس میں عبقریات کا ایک دور دراز زریں سلسلہ ہے، حضرت مرحوم کے والد گرامی مولانا سید محمد الحسنی عربی و اردو زبان کے صاحب طرز ادیب اور شگفتہ نظم و نثر نگار تھے انہیں ماہنامہ "البعث الاسلامی" اور پندرہ روزہ تعمیر حیات کے بانی مدیر کے طور پر بھی یاد کیا جاتا ہے، آپ کے دادا حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالعلی شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے جن کی مثالی خدمات سے ایک زمانہ آشنا ہے، جبکہ چچا مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ہیں جن کی شہرۂ آفاق زمانہ ساز شخصیت سے عالم اسلام نے خاطر خواہ اکتساب فیض کیا ہے، مولانا عبداللہ الحسنی کی تعلیم و تربیت کے بیشتر مراحل آپ ہی کی نگرانی میں طے ہوئے اور ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فراغت پائی۔

آپ کی ذات والا صفات میں رب کریم نے ایسے محاسن وکمالات ودیعت فرمادیے تھے جن سے آپ کی شخصیت کا فیض آب رواں کی شکل اختیار کر گیا تھا، ان کی زندگی کے قیمتی لمحات احقاق حق اور اشاعت دین کی پاکیزہ خدمت کرتے ہوئے گذرے، موصوف مرحوم نے اپنی صلاحیتوں کو ترقیات دین وملت ہی کا ذریعہ بنایا، وہ اگر چاہتے تو زرکشی کی بے شمار منزلیں طے کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے خاندانی بزرگوں کی انہیں روشن روایتوں کو آگے بڑھایا جن سے اس خاندان کی دیرینہ عظمتوں کی فلک بوس عمارتیں قائم ہیں۔ مفکر اسلام مولانا علی میاں ندویؒ کے صبر وقناعت اور استغناء کی چشم دید مثالیں تو زباں زد خاص وعام ہیں حضرت مولانا علی میاںؒ کا یہ وصف خاص بھی ان میں بدرجہ اتم پایا جاتا تھا، وہ ہر قسم کے صلہ وستائش سے بے پرواہ ہو کر ایسے پسماندہ علاقوں میں بھی کلمہ اور دعوت دین کی صدا بلند کرنے پہنچ جاتے جہاں بسا اوقات دوسروں کو تخلف ہوتا، ملک کا کونسا علاقہ ہوگا جہاں ان کے مضبوط قدموں کی دھمک سنائی نہ دی ہو۔ وہ اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر مشقت بھرے اسفار بھی سر کر لیتے اور خدا کے بندوں کو کفر وشرک اور الحاد ولادینیت سے بچانے اور نکالنے کی عملی تدابیر بروئے کار لانے میں کسی مداہنت یا مجاملت کا اسیر نہ ہوتے ہاں مگر اشتہار و پروپیگنڈہ سے ارادی طور پر انہیں پرہیز تھا اور وہ اسے دعوت الی اللہ کی حکمتوں کے منافی گردانتے تھے، بس اللہ علیم وخبیر ہی ان کی ان نیکیوں کا صلہ بخشنے والا ہے، انہوں نے اس مشن محمدی کو حرز جاں بنا کر جس طرح حکیمانہ کوششیں صرف کیں اور گم کردہ راہوں کو نشان منزل کا پتہ دیا اس سے ان کا نام اور کام ان شاء اللہ العزیز تا دیر زندہ رہے گا اور مرحوم کے اخلاف وتلامذہ بھی اس مقدس فریضہ کی انجام دہی میں کوشاں رہیں گے۔

یادش بخیر موقوف علیہ کے سال جب ترجمان دیوبند کے مدیر نے اس کی خصوصی اشاعت ''مشاہیر دیوبند نمبر'' کی نوید سنائی اور خاکسار کو حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے

پوریؒ پر لکھنے کا پابند بنایا تو محترم مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی نائب مدیر تعمیر حیات لکھنؤ نے دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں آنے کا مشورہ دیا تاکہ وہاں موجود اس نوعیت کی بعض دیگر نادر کتب سے بھی استفادہ کیا جاسکے، احقر کو یہ تجویز ازحد پسند آئی اور رمضان کا پہلا عشرہ وہاں گذارنے کی نیت سے رخت سفر باندھ لیا، چنانچہ وہاں حاضری ہوئی تو حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کے بعد مولانا عبداللہ الحسنی سے ہی مناسبت ہوئی، واقعی نہایت متواضع، باوقار اور اثر آفریں شخصیت کے پیکر، نہایت کشادہ ظرفی سے علیک سلیک ہوئی، دیوبند ورائے پور کے تعلق سے محبت وعقیدت بھرے تذکرے آپ کی نوک زباں رہے، حضرت مدنیؒ کے بعض واقعات بھی ارشاد فرمائے، چنانچہ آپ سے ملاقات ہوتی رہی، ظہر بعد حسب معمول آپ اہل مجلس کو تہذیب الاخلاق پڑھ کر سناتے اور سامعین کی بھرپور رعایت کرتے ہوئے احیاء سنت، اثبات توحید اور کفر وشرک کی مذمت ایسے موثر اسلوب میں کرتے کہ ان کا سوز دروں اور عشق ومعرفت الٰہی کا خیرخواہانہ جذبہ حاضرین کو آنسوؤں کی لڑی بہانے پر مجبور کردیتا، ان کا باثر طرز تخاطب اور کوثر وتسنیم سے دھلا دلنشیں بیان براہ راست دلوں کو اپیل کرتا، ان کی گفتگو حشو وزوائد سے پاک اور پرمغز ہوتی، بولتے تو موتی رولتے سامع ہمہ تن گوش رہتا اور حظ وافر حاصل کرتا۔

الغرض علم وعمل سے آراستہ ایسی بساغنیمت ہستی سے بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا جذبہ پروان چڑھا، پھر دیوبند آپ کی تشریف آوری پر مکرر ملاقاتیں رہیں لیکن کیا معلوم تھا کہ قلیل سی مدت میں شہرتوں اور وسیع دینی ودعوتی خدمات کے مراحل طے کرنے والا یہ ہر دل عزیز انسان عمر عزیز کے محض ۵۶ رسال پورے کرکے اپنے پردادا حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی طرح کم عمری میں عالم جاودانی کی طرف منتقل ہوجائے گا۔ تقبل اللہ حسناتہ وتجاوز عن زلاتہ۔ ان کے حادثۂ وفات کی

اطلاع جب آپ ہی کے ایک تلمیذ اور مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفر آباد کے استاذ مولانا ریاض احمد ندوی نے بذریعہ فون سنائی تو بے ساختہ زبان پر استرجاع کے کلمات جاری ہوگئے اور مدیر جامعہ حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ صاحب مدظلہم کو بھی اس دل خراش حادثہ سے مطلع کیا گیا، آپنے ایصال ثواب کرا کے دعاء مغفرت کرائی اور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے نام اپنے تعزیتی مکتوب میں اس تازہ صدمہ پر اپنے شدید رنج رغم کا اظہار کیا، دعا ہے کہ اللہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرما کر جملہ پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے اور امت کو ان کا نعم البدل مرحمت فرمائے آمین۔

(یہ مضمون ماہنامہ صدائے حق بابتہ ماہ مارچ، اپریل ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا)

بے شمار خوبیوں کے حامل

جناب ماسٹر جمیل احمد گھانویؒ

۵/جمادی الاول ۱۴۳۴ھ مطابق ۱۸/مارچ ۲۰۱۳ء بروز دوشنبہ ساڑھے تین بجے دن جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ کے شعبۂ پرائمری کے نگراں استاذ، علم دوست ادب نواز اور مرنجاں مرنج شخصیت کے پیکر جناب ماسٹر جمیل احمد قیصر گھانوی بھی اپنی حیات مستعار کے کم وبیش ۷۵/سال پورے کرکے طویل علالت کے بعد رحلت فرماگئے اناللہ وانا الیہ راجعون، ان للہ ما اعطیٰ ولہ ما اخذ وکل عندہ بأجل مسمیٰ۔

موصوف مرحوم ادھر چند ماہ سے علیل چل رہے تھے لیکن یہ علالت جب باعث تشویش ہوئی تو انہیں دہلی کے کسی اچھے نرسنگ ہوم میں دکھایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے بے قابو کینسر تشخیص کیا بہرکیف علاج ومعالجہ کی ضروری تدابیر بروئے کار لائی گئیں مگر ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

بالآخر مرحوم قضاء وقدر کے فیصلے پر لبیک کہتے ہوئے افق آخرت میں ہمیشہ کے لیے غروب ہوگئے ؎

جان کر منجملۂ خاصان میخانہ مجھے مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ مجھے

ماسٹر جمیل احمد سہارنپور کے مضافات میں واقع موضع گھانہ کے باسی تھے، ابتدائی دینی تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ عصری مضامین کی تدریس میں انہیں خاصا درک حاصل تھا۔ اس لیے جب ماہر تعلیم اور اشرف العلوم کے بانی مدیر حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحبؒ نے جامعہ کے پرائمری نظامِ تعلیم کو وسعت ومستحکم کرنے کا بیڑہ اٹھایا تو آپ کی نظر انتخاب موصوف

مرحوم پر پڑی چنانچہ ۱۴؍ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ مطابق ۹؍ مئی ۱۹۷۱ء بروز دوشنبہ آپ کا تقرر برائے تدریس جامعہ ہذا میں کرلیا گیا جسے مرحوم نے باحسن وجوہ تادم حیات نبھایا اور ۴۲؍ سال تک ہزاروں تشنہ کامان علم وفن کو سیراب کیا۔

ماسٹر جمیل احمد گورخصت ہو گئے لیکن طلبہ و مستفیدین کی شکل میں ایسے روشن چراغ بھی چھوڑ گئے جن کی ضیاء پاش کرنیں یقینا مرحوم تک پہنچیں گی ان شاء اللہ۔ بہرکیف اسی روز آپ کی نماز جنازہ جامعہ کے روح رواں حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ صاحب دامت برکاتہم نے پڑھائی اور شب کے ۹؍ بجے مرحوم کو گور غریباں (قبرستان امام صاحب) میں ہمیشہ کیلئے پیوند خاک کردیا گیا ؎

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ وہ اس گھر کی نگہبانی کرے

آپ کے پسماندگان میں تین صاحبزادے اور اتنی ہی صاحبزادیاں ہیں، اللہ پاک سبھی کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی فرمائے اور مرحوم کو رحمت ومغفرت کا پروانہ عطا کرے۔

(یہ مضمون ماہنامہ صدائے حق بابتہ ماہ مارچ، اپریل ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا)

ممتاز عالم دین وشارح کتب درسیہ

مولانا محمد حنیف گنگوہی کا انتقال

دینی مدارس ومراکز ایک بافیض شارح اور بلند پایہ مترجم سے محروم

گنگوہ ۱۰ رجون (پریس ریلیز) برصغیر ہندوپاک بنگلادیش میں قائم مدارس اسلامیہ کے مروجہ درس نظامی میں شامل متعدد کتابوں کے ممتاز شارح اور ترجمہ نگار مولانا محمد حنیف گنگوہیؒ کا آج اپنے وطن قصبہ گنگوہ میں صبح تین بجے ۸۰ ربرس کی عمر میں انتقال ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون، وہ ادھر ایک عرصہ سے بسلسلۂ تدریس وتالیف دیوبند میں مقیم تھے

۔

حضرت مولانا محمد حنیف 1936ء میں قصبہ گنگوہ کے محلہ غلام اولیاء میں الحاج شریف احمد انصاری کے یہاں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وتربیت مقامی ادارہ جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ میں ہوئی جہاں 1944ء سے 1953ء تک تعلیمی سلسلہ جاری رہا اور دیگر اساتذہ کے علاوہ اشرف العلوم کے بانی حضرت مولانا قاری شریف احمد گنگوہیؒ سے کسب فیض کیا آپ کی ہی سرپرستی میں اعلیٰ تعلیم کیلئے مفتاح العلوم جلال آباد اور پھر دارالعلوم دیوبند پہنچے جہاں 1376ھ میں دورۂ حدیث شریف سے فراغت حاصل کی، بخاری شریف شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے پڑھی، بعدازاں تدریسی زندگی کا آغاز اپنی مادر علمی اشرف العلوم رشیدی گنگوہ سے کیا اور تین سال تک عربی درجات کے مقبول استاذ رہے، بعض دیگر مدارس میں بھی درسی خدمت کی، آپ کا اصل مشغلہ تصنیف وتالیف رہا انہوں نے درس نظامی کی بہت سی مشکل سمجھی جانے والی کتابوں کی شروحات لکھیں، ترجمے

کئے جس سے ان کی علمی شخصیت ابھر کر سامنے آئی، حضرت مولانا محمد حنیف کی نماز جنازہ بعد نماز ظہر جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ کے ناظم حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ گنگوہی نے پڑھائی جس میں اہل علم کی بھی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اور مقامی قبرستان میں انہیں ہمیشہ کیلئے پیوند خاک کر دیا، آپ کے حادثہ وفات کی خبر دینی و علمی حلقوں میں شدت غم کے ساتھ سنی گئی اور ایصال ثواب کر کے مرحوم کیلئے دعاء مغفرت کی گئی۔

مغربی یوپی کی ممتاز درسگاہ جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ میں ان کے انتقال کی خبر ملتے ہی پورا ماحول سوگوار ہوگیا دریں اثناء آپ کے سانحہ رحلت پر سرکردہ شخصیات نے اپنے شدید رنج وغم کا اظہار کیا ہے، جامعہ کے ناظم حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ قاسمی نے فرمایا کہ مولانا محمد حنیف گنگوہیؒ ممتاز شارح اور قابل قدر عالم دین تھے، وہ اشرف العلوم کے ہونہار ابتدائی فیض یافتگان میں سے تھے ان کے انتقال سے جامعہ نے اپنا ایک نامور سپوت کھودیا، جامعہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا وسیم احمد سنسار پوری نے فرمایا کہ وہ جامعہ کے قدیم زمانہ کے مقبول مدرسین میں سے ایک تھے، استاذ حدیث حضرت مولانا محمد سلمان گنگوہی نے فرمایا کہ وہ میرے استاذ تھے میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور سمجھا، اللہ ان کی بال بال مغفرت فرمائے، خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں جامعہ کے دیگر اساتذہ مولانا محمد احسان رشیدی، مولانا عبدالواجد ندوی، مولانا محمد صابر قاسمی، مولانا بلال اشرف، مولانا محمد دلشاد رشیدی، مولانا شکیل احمد اور قاری محمد طالب ہریانوی بھی شامل ہیں۔

(یہ مضمون بصورت خبر متعدد اردو روزناموں سمیت ماہنامہ صدائے حق بابتہ ماہ جنوری ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا)

ایک شریف باصفا کی یاد میں

حضرت الحاج حافظ محمد یامین صاحب علیہ الرحمہ

مے کشی رخصت ہوئی، ہاتھوں سے پیمانہ گیا
پھیر لیں ساقی نے آنکھیں، ہم سے مے خانہ گیا

یہ دنیا بلاشبہ تغیرات کا عالم ہے، اس کی صبح وشام میں گردش دوراں کا مستحکم عمل خود اس کیلئے تازیانۂ عبرت، ہر شے میں تغیر اور فنا کا مرحلہ اس کیلئے ناگزیر، فنا اور بقا کے اس خدائی دستور پر نگاہ ڈالئے تو اس احکم الحاکمین کے بے مثال قبضہ وقدرت کا استحضار ہر دم بڑھتا ہی جاتا ہے کہ دنیا کی ہر شے بے اعتبار، آخر کسے دائمی قرار کا حوصلہ کہ وہ قانون الٰہی کل من علیھا فان پر ذرا بھی چیں بجبیں ہو سکے بلکہ اہل بصیرت تو صاف صاف کہہ گئے کہ ؎

انقلابات جہاں واعظ رب ہیں سن لو
ہر تغیر سے صدا آتی ہے فافہم فافہم

افسوس کہ اسی گردش شام وسحر سے متاثر ہوکر ہمارے شہر سہارنپور اور اس کے مضافات کی ایک دلنواز شخصیت، سالکین وطالبین کی دستگیری کرنے والے قابل قدر دینی پیشوا اور ہم سبھوں کے لائق احترام بزرگ جناب حضرت الحاج حافظ محمد یامین ڈھالوی علیہ الرحمہ بھی ۴؍شوال المکرم ۱۴۳۴ھ مطابق ۱۱؍اگست ۲۰۱۳ء شب دوشنبہ میں اپنی حیات مستعار کے ماہ وسال پورے کرکے اللہ کے جوار میں چلے گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت حاجی صاحب واقعی بڑے کام کے آدمی تھے، وہ اگرچہ قافلۂ علم وادب کا حصہ تو نہیں تھے۔ نہ کسی ممتاز درسگاہ سے انہوں نے باضابطہ فاتحۂ فراغ پڑھی تھی، قلم وقرطاس سے بھی ناچیز کی دانست میں انہیں کوئی سروکار نہ تھا، تصنیف وتالیف کا کوئی سرمایہ بھی شاید ہی انہوں نے بطور یادگار چھوڑا ہو، لیکن ہاں اگر ان کے محاسن وکمالات پر گفتگو کی جائے، ان کے ذریعہ انجام دئے گئے دینی کارناموں پر طبع آزمائی کی جائے اور افراد سازی کے ان کے سنہرے عمل کو زیب داستان بنایا جائے تو پھر کتنے ہی نام ور لوگ بھی ان کے سامنے بونے نظر آئیں گے، اور ان کے دینی مآثر وخدمات پر رشک کناں ہونگے، یقیناً موصوف مرحوم ان خضر صفت بزرگوں کے وارث تھے جو شور وشغب اور ہٹو بچو والی زندگی سے گریزاں ہوکر نہایت خلوص ونیک نامی سے دین ومذہب کی نشر وحفاظت کا حسین امتزاج پیش کرتے ہیں، انہیں اپنے سلف سے اخفائے حال کا دستور ودیعت ہوتا ہے، اسی لئے شہرت وناموری سے انہیں اللہ واسطے کا بیر ہوتا ہے، حضرت حاجی صاحبؒ کی حیات وخدمات پر سرسری نگاہ ڈالنے والا بھی اس بے غبار سچائی کا اعتراف کرے گا کہ وہ بھی خدمت دین کی انجام دہی میں محض رضائے الٰہی کو مطمح نظر رکھتے ہوں گے، یہی وجہ ہے کہ ملک کی کسی شہرت پذیر درسگاہ سے انتساب نہ ہونے کے باوجود اللہ نے ان کے نام اور کام کو محبوبیت عطا کی، ایک چھوٹی سی بستی ''ڈھالہ چورا'' کو انہوں نے اپنی جدوجہد کا مرکز بنا کر مختلف سمتوں میں ''خدمت دین'' کا بیڑا اٹھایا، مدرسہ ومکتب اور خانقاہ کی شکل جس شجر طوبیٰ کی انہوں نے آبیاری شروع کی تھی وہ ان کے حین حیات ہی برگ وبار لایا اور مسرت وشادمانی نے ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائی، یہ مرحوم کے نصیبہ کی بات تھی یا پھر ان کے کبار مشائخ اہل اللہ کی روحانی توجہات کہ آخر زمانہ میں خلق خدا ان کے میکدۂ عرفان پر دیوانہ وار جمع رہتی، دراصل یہ دولت انہیں اپنے مرشد روحانی حضرت الحاج

حافظ عبدالستار نانکوی علیہ الرحمہ کی بے پناہ خدمت وزیارت کے نتیجہ میں حاصل ہوئی تھی، جہاں وہ پہلے ہی دن سے سلوک ومعرفت کا جام پینے لگے تھے، اب یہ اہل معرفت ہی بتا سکتے ہیں کہ حضرت نانکوی علیہ الرحمہ کا روحانی مقام ومرتبہ کیا تھا؟ اور وہ غوث وقطبیت کے کس مقام پر تھے؟ لیکن جس طرح انہوں نے سلوک ومعرفت کے جام لنڈھائے گم کردہ راہوں کو جادۂ مستقیم پر گامزن کیا اور ایمان باللہ کی حقیقی لذت سے اس کے نام لیواؤں کو آشنا کیا تو اس سے واقعی خیر القرون کی سی یادیں تازہ ہوگئیں، جس سے لوگوں کے ظاہر وباطن پر شریعت ومذہب کا حقیقی رنگ چڑھتا ہوا نظر آیا کسی نے سچ ہی کہا تھا کہ وہ اللہ کی سرزمین پر ایک شاداب پھول تھا جس سے خزاں رسیدہ موسم میں بھی بہارِ نو کا منظر دیکھنے میں آیا، اب ایسے قوی النسبت ولیٔ باصفا نے اپنے اس سچے مسترشد پر روح وروحانیت کے کیا کچھ گہرے نقوش نہ چھوڑے ہوں گے اسے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے، چنانچہ حافظ محمد یامین صاحبؒ اپنے شیخ کے اس مذکورہ وظیفہ دین کے سنانے اور پہنچانے میں زندگی بھر کوشاں رہے، خانقاہ رائے پور کی عالمی روحانی تحریک کے فروغ میں وہ حسب بساط متحرک نظر آتے تھے، ذاتی طور پر بھی اللہ نے انہیں امتیازی صفات عنایت فرمائی تھیں۔ خوش اخلاقی، تواضع وانکساری اور شفقت علی الخلق ان کے جبلی اوصاف تھے، وہ جہاں جاتے لوگ انہیں عقیدتوں کا تحفہ پیش کرتے، انہیں سر پر بٹھاتے، ان سے بیانات اور دعاء کراتے، ان کے قرب میں بیٹھنے کی کوشش کرتے، وہ بھی کسی کا دل میلا نہ ہونے دیتے، انہیں کہیں مدعو کیا جاتا تو وہ بہر صورت وہاں پہنچنے کی کوشش کرتے بلکہ ایسا محسوس ہوتا کہ توحید کے نغمے سنانے میں انہیں بے حد مزہ آتا تھا، خدا کا یہ بندہ اپنے آخری دم تک توحید کی امانت سینوں میں منتقل کرتا رہا، ایمان وعقیدہ کے تحفظ پر زور دیتا رہا، معاشرہ کی اصلاح کیلئے پگھلتا رہا اور اتحاد بین المسلمین کے زمزمے بلند کرتا رہا، ان کی

راہوں میں پھول آئے اور کانٹے بھی، موافق ومخالف حالات نے بھی انہیں پابہ زنجیر کیا، زمانہ کے مدوجزر بھی انہوں نے برداشت کئے، عسرو یسر کی صحبتیں بھی انہیں میسر آئیں، لیکن آہنی حوصلوں کا یہ خدا رسیدہ انسان ''دعوتِ توحید وسنت'' کے پیغمبری مشن سے ایک انچ بھی ہٹنے کا روادار نہ تھا، بلکہ جب تک وہ بقید حیات رہے ایک باکردار انسان بن کر رہے اور جب قضاء وقدر نے انہیں آواز دی تب بھی بصد شکر ان کی نوک زباں شاید یہ کلمات تھے کہ ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ان گنت خوبیوں کے حامل اس مرد قلندر نے تو اپنے وقت موعود پر آخرت کی راہ لی، لیکن ان کے دم فیض سے بیعت وارشاد کے جو حلقے سجے تھے اور روح ومعرفت کی جو بستیاں روشن تھیں ان کے متوالے آج تک انہیں ڈھونڈ رہے ہیں مگر کہاں کیوں کہ ؎

ڈھونڈ وگے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہو جس کی حسرت وغم اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

اللہ پاک ان کی بال بال مغفرت فرمائے، اعلیٰ علیین میں جگہ دے، جملہ پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے اور حضرت مرحوم کا قائم فرمودہ ادارہ ''مدرسہ نافع العلوم'' کل روز قیامت ان کے حق میں گواہ رہے، آمین۔

دین ودانش کا وہ مخلص ترجمان جاتا رہا

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ

لیجئے! ۲۲؍ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ شب کے ساڑھے گیارہ بجے ممتاز صاحب علم وقلم اور سحر طراز نثر نگار حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی بھی اپنی زندگی بھر کی طویل دینی وعلمی خدمات کا صلہ پانے کی خاطر اللہ کے جوار میں چلے گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، تغمدہ اللہ بغفرانہ وتجاوز عن زلاتہ۔

۲۹؍ستمبر ۲۰۱۳ء کی علی الصبح ماہنامہ مظاہر علوم سہارنپور کے مدیر جناب مولانا عبداللہ خالد قاسمی خیرآبادی نے اس الم ناک حادثہ کی اطلاع بذریعہ ایس ایم ایس جب اس خاکسار کو دی تو دل ملول سا ہو کر رہ گیا اور دعاء مغفرت وایصال ثواب کے سوا کچھ بھی نہ بن پڑا کہ آخر یہاں سے کوسوں میل دور یہ مرد قلندر اور شریف باصفا اپنے وطن میں دنیوی جھمیلوں سے بے پرواہ اب میٹھی نیند سو رہا تھا اور زبانِ حال سے یوں گویا تھا کہ:

حشر تک اب زباں نہ کھولیں گے
تم پکاروگے ہم نہ بولیں گے

آہ! وہی صاحب نسبت بزرگ جس کے قلم وزباں سے ایک زمانہ آشنا تھا جس کے رگ وپے میں اسلام کی غیرت وحمیت کا لہو گردش کرتا تھا، وہ جس نے احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ حیدری شان سے زندگی کے تاروپود بکھرنے تک بھرپور انداز میں ادا کیا، آخر ملک کا کونسا خطہ ہوگا جہاں ان کے مضبوط قدموں کی دھمک سنائی نہ دی ہو، مبدأ فیاض نے انہیں بے شمار اوصاف وکمالات کا وافر حصہ ودیعت کیا تھا، وہ ایک داعی الی اللہ

بافیض عالم دین مقبول مدرس اور دانا و درویش شخصیت کے طور پر عوام و خواص کے مابین محبوب و محترم تھے، ان کے شب و روز لوح و قلم کی پرورش اور اصلاح و ارشاد کی وقیع خدمت ہی میں صرف ہوتے تھے، اسی لئے دین و دانش کے متقدر شعبوں میں ان کی نمایاں خدمات لائق رشک بھی ہیں اور قابل اُسوہ بھی۔

۵ر فروری ۱۹۵۱ء کو ضلع اعظم گڈھ حال ضلع مؤ کے بھیرہ قریہ میں آنکھیں کھولنے والے مولانا اعجاز احمدؒ نے اپنی تعلیم کے ابتدائی مراحل گاؤں ہی میں پورے کئے پھر مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور اور وہاں سے ازہر الہند دار العلوم دیوبند پہنچے لیکن وہاں کا قیام بہت مختصر رہا، آخرش امروہہ کے چلہ مدرسہ سے ۱۹۷۱ء میں سند فراغ حاصل کی، ۱۹۷۲ء سے اپنی عملی تدریسی زندگی کا آغاز کرنے والے مولانا اعظمی کا علمی سفر تیز گامی کے ساتھ فاتحانہ انداز میں جاری رہا اور جامعہ اسلامیہ بنارس، مدرسہ دینیہ غازی پور، جامعہ ریاض العلوم گورینی جون پور وغیرہ میں تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپورہ میں آپ کا ٹھہراؤ ہوا جہاں کم وبیش ۲۴ رسال تک آپ کا دینی و علمی فیض برابر جاری رہا اور تشنہ کامان علم وفن آپ کے خوانِ علم سے ریزہ چینی کرتے رہے، اس درمیان متعدد مجلات ورسائل کی ترتیب وادارت کے فرائض بھی نہایت خوش اسلوبی سے نبھائے، مولانا اعظمی انتہائی شگفتہ رقم تھے وہ واردات قلبی کو لفظوں کا ایسا خوبصورت پیرہن بخشتے کہ اس کے پڑھنے کی حلاوت قاری کو عش عش کرنے پر مجبور کر دیتی، ان کے یہاں مضمون کی آمد بلا کی ہوتی، جملوں اور تراکیب کے حسن استعمال میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا وہ انتہائی زود نویس ہونے کے علی الرغم تحقیق و معیار کی بلند سطح سے ہٹنے کے بالکل روادار نہ تھے۔

علم وادب کی مختلف اصناف پر انہوں نے اپنے قلم کو حرکت دی، کوئی ادق موضوع بھی ان کے احاطہ وقبضہ سے باہر نہ ہوتا، جس موضوع پر بھی لکھتے خوب لکھتے، اس

کے مالہ وماعلیہ پر سیر حاصل بحث کرتے ، یہی وجہ ہے کہ دو درجن سے زائد ان کے علمی وقلمی معرکہ اپنی افادیت ووقعت کے ساتھ تنوع وتجدد کی شان لئے ہوئے ہیں جن میں تسہیل الجلالین شرح اردو جلالین ، حیات مصلح الامت ۔کھوئے ہوؤں کی جستجو۔ (شخصیات پر لکھے مضامین کا مجموعہ) حکایت ہستی (خودنوشت سوانح) اداریوں کا مجموعہ) سرفہرست ہیں (دیکھئے دارالعلوم دیوبند کا صحافتی منظرنامہ از نایاب حسن قاسمی)۔

حضرت مولانا اعظمی کا سانحۂ وفات کسی فرد واحد یا کسی خاندان کا ذاتی حادثہ نہیں ہے بلکہ ہر شخص کیلئے صدمہ کا باعث ہے جو دین وادب کا رسیا ہو اور افراد شناسی واحسان مندی کی دولت اسے حاصل ہو، یقینا مولانا موصوف سچے خادم علم دین سلیقہ مند معلم تھے، انہوں نے دین ودانش کی بے لوث خدمت کی، بے شمار علماء وفضلا ان کی نگرانی وتربیت میں تیار ہوئے، کتنوں نے ان کے خوانِ علم سے خوشہ چینی کر کے خدمتِ دین کا بیڑا اٹھایا، الغرض ان کی حیات مستعار کے قیمتی لمحات نغمۂ توحید کے سنانے اور بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لیجانے میں ہی صرف ہوئے، جس کی منجانب اللہ انہیں توفیق بخشی گئی تھی، اب ان کے مآثر ومعارف اور دینی خدمات کو دیکھ کر یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے ان مستجاب روشن کارہائے نمایاں کے سبب جنات نعیم میں خوش وخرم ہوں گے اور ہر قسم کی راحتیں وبرکتیں ہر آن انہیں وہاں میسر ہونگی، اللھم آمین۔

آسماں لحد پہ ان کی شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ وہ اس گھر کی نگہبانی کرے

باوقار مدرس، نکتہ سنج محقق

شیخ الحدیث حضرت مولانا واجد حسین دیوبندیؒ

۱۴ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ مطابق ۲۶ جنوری ۲۰۱۴ء بروز اتوار علی الصباح جبکہ یہ نامہ سیاہ مظاہر علوم سہارنپور کے بزرگوں سے دید وملاقات کیلئے پابہ رکاب تھا کہ اچانک دیوبند کے ایک صحافی دوست نے شیخ الحدیث حضرت مولانا واجد حسین دیوبندیؒ کے حادثۂ رحلت کی اندوہ ناک خبر سنائی، نہایت صدمہ وافسوس کی اس دگرگوں حالت میں کلمات استرجاع وغیرہ جو کچھ بن پڑا وہ کیا لیکن اب لگتا ہے کہ اس خدا مست قلندر کے داغ مفارقت کی کسک شاید مدت دراز تک یونہی محسوس ہوتی رہے گی اور ان کی وفات سے آئے زخم یوں آسانی سے مندمل نہ ہوں گے، خصوصاً اس لئے بھی کہ جس ماحول اور یادوں کی نگری کے وہ پروردہ تھے وہاں ایسی عبقریات کا وجود باجود اب کم یاب بلکہ ناپید ہے، واقعی یہ وہ لوگ تھے جن کی زندگی کا ہر لمحہ اسلام کی اشاعت وحفاظت میں صرف ہوتا تھا، ان کے علم وعمل کا فیضان آب رواں کی طرح جاری تھا اور بتوفیق الٰہی فقدان وسائل کے باوصف انہوں نے علم ومعرفت کی درسگاہیں کبھی سونی نہ ہونے دی ع

کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہاں اک چراغ جلادیا

حضرت مولانا واجد حسین دیوبندی بقیۃ السلف تھے، ان کے چہرے بشرے سے علم وعمل کے آثار ہویدا تھے، ذکر وفکر سے آراستہ ان خدارسیدہ اہل علم کی زیارت سے

ہی دل ودماغ کے دریچے وا ہوجایا کرتے تھے اور علم ومطالعہ کا جذبہ جنون کی حد تک پروان چڑھتا تھا، کبھی دل گواہی دیتا کہ یا اللہ یہ تیرے خاکی پتلے علم وحکمت کی چمک سے جب اتنے ضوفشاں ہیں تو ان کے بڑے اور بڑوں کے بڑے کیسے کیسے آفتاب وماہتاب ہوں گے؟ یہ تاثر بایں وجہ ہے کہ دارالعلوم پر ایک دور ایسا بھی گذرا ہے جب ایک دربان سے لیکر ذمے داران اہتمام تک ہر شخص صاحب نسبت ہوا کرتا تھا، دولت وشہرت اور ریا ونمود سے تو انہیں گویا خدا واسطے کا بیر تھا۔ مگر افسوس کہ ہمارے ان دینی قلعوں اور روحانی وتبلیغی مراکز کی یہ سنہری روایتیں بھی اب زوال پذیر ہیں۔ جو بادہ کش پرانے تھے ان کے چلے جانے کی صورت میں اب میخانے بھی سونے سے نظر آتے ہیں۔ مولانا واجد حسینؒ کا حادثۂ وفات بھی اسی لاریب حقیقت کا غماز ہے

ع

بہت لگتا تھا دل صحبت میں ان کی وہ اپنی ذات میں اک انجمن تھے

بلاشبہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ علم وعمل کا پرکیف امتزاج تھے۔ ان کی متاثر کن شخصیت دلوں کو موہ لیتی تھی، اب سے ایک دہائی قبل کی بات ذہن کی اسکرین پر بار بار ابھر رہی ہے، بندہ راقم الحروف مادر علمی دارالعلوم کے ایام طالب علمی میں اپنے ایک درسی ساتھی کی معیت میں دارالکتاب دیوبند کوئی کتاب لینے کی غرض سے پہنچا، دیکھا کہ ایک وجیہ ونورانی شخصیت وہاں تشریف فرما ہے اور کتنے ہی ہم جیسے انہیں عقیدت بھری نگاہوں سے بغور دیکھ رہے ہیں، بندہ کے استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات کے محدث دوراں اور ترجمان دیوبند کے ایڈیٹر مولانا ندیم الواجدی صاحب کے والد گرامی مرتبت ہیں۔ اسے حرماں نصیبی ہی سے تعبیر کریجئے اس وقت اور نہ بعد میں ان سے شفاہی ملاقات خواہش کے باوجود بھی مقدر نہ ہوسکی، وکان امر اللہ قدراً مقدوراً۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔

دار العلوم کے زمانہ طالب علمی میں ان کی علمی عظمتوں کے چرچے خوب سنے۔ بلاشبہ وہ ایک بلند پایہ محدث، کامیاب مدرس، ہر دل عزیز استاذ اور ایک علمی خانوادے کے چشم وچراغ تھے، ان کے والد بزرگوار حضرت مولانا احمد حسن دیوبندیؒ (متوفی ۱۹۸۴ء) دار العلوم دیوبند کے استاذ اور جامعہ مفتاح العلوم جلال آباد کے شیخ الحدیث تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے علمی وادبی ماحول میں جس نے آنکھیں کھولی ہوں تو وہاں کی تہذیب وتربیت اس کی تشکیل وتعمیر میں کیوں کر چار چاند نہ لگاتی، چنانچہ مولانا نے ابتدائی تعلیم کے مراحل طے کر کے دار العلوم میں داخلہ لیا اور ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۲ء میں وہاں سے سند فراغ حاصل کی، آپ کے اساتذۂ ذیشان میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی اور امام المنقول والمعقول حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ جیسے اصحاب فضل وکمال شامل وسرفہرست ہیں۔

دار العلوم سے اکتساب فیض کرنے کے بعد مولانا کو کسی معیاری درسگاہ کی تلاش تھی کہ والد صاحب کے مشورہ وایماء پر ۱۹۵۶ء میں مفتاح العلوم جلال آباد میں برائے تدریس عربی کتب آپ کا تقرر منظور ہوا اور میزان الصرف سے لیکر ابوداؤد شریف تک اکثر کتابیں زیر تدریس رہیں۔ واقف کار بتاتے ہیں کہ مولانا کا انداز درس بڑا خوب صورت تھا۔ وہ نہایت مشکل سے مشکل ابحاث کو یونہی چٹکیوں میں حل فرمادیا کرتے تھے، دقیق ترین ابحاث اور مشکل ترین مضامین کی تفہیم میں انہیں خاص ملکہ تھا۔ وہ فن پڑھاتے تھے، طلبہ ان کی خداداد صلاحیت کے معترف اور ان کے تربیتی انداز کے قائل تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب اس دانش گاہ کی شہرتوں کے چرچے پورے برصغیر میں عام تھے اور ہونہار طلبہ یہاں جوق در جوق آکر اپنا دامن مراد بھرتے، یہیں آپ کو مسیح الامت حضرت مولانا مسیح

اللہ خاں جلال آبادیؒ، حضرت مولانا مفتی نصیر احمدؒ، حضرت مولانا محمد یٰسین اور حضرت علامہ محمد رفیق بھیسانویؒ جیسے مشاہیر اہل علم سے بھی قربت رہی۔ مفتاح العلوم کا یہ پچیس سالہ تدریسی زمانہ مولانا مرحوم کی علمی عظمت و شوکت کا حوالہ شناخت بن گیا اور آپ کے فیضان علم و ادب سے کتنے ہی تشنہ کامان فکر و آگہی مستفید ہوئے جن میں حضرت مولانا صفی اللہ خانؒ، حضرت مولانا مفتی مہربان علی بڑوتویؒ، مولانا مفتی شعیب اللہ خان بنگلوری اور مولانا مفتی محمد فاروق میرٹھی مدظلہم جیسے اساطین علم و فضل قابل ذکر ہیں۔ مفتاح العلوم کا ماحول جب تک سازگار رہا اور بڑوں کا بڑکپن اس کے وابستگان سے منفک نہیں ہوا تو مولانا بھی وہاں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے مگر پھر متعدد وجوہ کے باعث ان کا قیام ممکن نہ رہا اور انہوں نے جلد ہی جلال آباد کو خیر آباد کہہ دیا۔ ادھر دو سال جامعہ اسلامیہ ریڑھی تاجپورہ میں بحیثیت شیخ الحدیث آپ کا قیام رہا اور علم و فضل کی آپ کی مسلمہ شخصیت نے یہاں بھی گہرے اثرات چھوڑے۔ دریں اثنا حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کی تائید و تصدیق پر آپ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے ارباب انتظام کی فرمائش پر گجرات تشریف لے گئے جہاں کے مدیر حضرت مولانا سید محمد بزرگ کو آپ جیسے متبحر عالم دین اور پختہ کار مدرس کی ضرورت تھی، چنانچہ ۱۹۸۳ھ میں آپ کا تقرر ہوا اور اکثر کتب آپ کے زیر تدریس رہیں، درس تفسیر و حدیث میں آپ کا جواب نہیں تھا، طلبہ آپ سے بے حد مانوس رہتے تھے اور آپ کے کمالاتِ علم و فضل کے معترف بھی، اسباق کی پابندی اور غیر حاضری سے اجتناب مولانا کا وظیفہ حیات تھا، وہ اسے طلبہ اور خود مدرس کیلئے غیر مناسب سمجھتے تھے، پھر اللہ نے انہیں مزید رفعتوں کی معراج کرائی تو وہ منصب شیخ الحدیث پر فائز کئے گئے۔ مدارس کی زندگی میں گویا یہی آخری معراج ہے جس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ حضرت مولانا نے اس قدیم علمی دانش گاہ کے منصب مذکور کو پورا اعتبار بخشا اور اس عہدہ پر کوئی آنچ آنے نہیں دی۔

جبکہ یہاں اپنے اپنے زمانہ کے اعلام امت متمکن ہوکر اب محوخواب ہیں، جن میں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، فقیہ الامت مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ اور صاحب معارف السنن مولانا محمد یوسف بنوریؒ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

الغرض شیخ الحدیث حضرت مولانا واجد حسین بھی انہی پرکھوں کی بہترین یادگار تھے جن کا بابرکت وجود قافلۂ علم وعمل کیلئے بھی بسا غنیمت تھا، اللہ آپ کو غریق رحمت فرمائے اور جملہ پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق فرمائے۔ مزار قاسمی میں جب اس خادم دین وملت کو منوں مٹی کے نیچے سلایا جارہا تھا تو کتنے ہی شکستہ دل اور اشک بار آنکھیں بزبان حال یوں گویا تھے ع

زندگانی تھی تیری مہتاب سے تابندہ تر — خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو تیرا — نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو تیرا

آپ کے سانحۂ ارتحال کی خبر علمی اور دینی حلقوں میں شدت غم کے ساتھ سنی گئی اور ملک وبیرون ملک کی سرکردہ شخصیات نے ایصال ثواب کرکے انہیں خراج عقیدت پیش کیا، یہاں جامعہ اشرف العلوم رشیدی میں بھی ان کے حادثۂ فاجعہ کو غیر معمولی طور پر محسوس کرتے ہوئے حضرت مرحوم کیلئے دعائے مغفرت کا اہتمام کیا گیا اور رئیس الاہتمام حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ صاحب مدظلہم نے آپ کے علمی جانشین اور معروف صاحب قلم مولانا ندیم الواجدی صاحب کے نام اپنا تعزیتی پیغام ارسال فرمایا۔

(یہ مضمون ماہنامہ ترجمان دیوبند ماہ مارچ ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا)

پاکیزہ روایتوں کے طرح دار

حضرت الحاج محمد عاشق الٰہی رامپوریؒ

۳؍ربیع الآخر ۱۴۳۵ھ مطابق ۴؍فروری ۲۰۱۴ء بروز منگل بوقت سحر ضلع کے صدر مقام سے بیس کلومیٹر دور قصبہ رام پور منیہاران کے حضرت الحاج محمد عاشق الٰہی اپنی حیات مستعار کی نوے سے زائد بہاریں دیکھ کر راہی ملک بقاء ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون O تقبل اللہ حسناتہ وتجاوز عن زلاتہ۔

مرحوم موصوف نہایت متواضع، ذاکر وشاغل، خادم دین وملت اور سلف صالحین سے وابستگی جیسے اوصاف وکمالات سے آراستہ ومزین تھے، بچپن ہی سے خدا مستوں سے تعلق ہو گیا تھا جہاں شریعت ومعرفت کے جام لنڈھائے جاتے، حاجی صاحب بھی مقدر کے سکندر نکلے۔ اولاً انہوں نے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ اجل وعاشق زار حضرت الحاج محمد شمشاد کلانوریؒ سے ارادت کا رشتہ قائم کیا جو آپ کے وطن ماجری سے محض دس کلومیٹر دور موضع چرہو میں دکان معرفت لگائے بیٹھے تھے، حاجی عاشق الٰہی نے یہاں اپنے شیخ کی خدمت میں رہ کر سلوک وارشاد کی منزلیں طے کی اور بامراد ہوئے، آپ کے انتقال کے بعد مظاہر علوم سہارنپور کے ناظم حضرت مولانا شاہ محمد اسعد اللہ رام پوریؒ سے رجوع فرمایا، انہوں نے بھی دستگیری فرمائی اور خرقۂ خلافت سے سرفراز کیا۔

موصوف نے دین واصلاح کیلئے زندگی بھر کوششیں فرمائی۔ متعدد ادارے قائم کئے اور اسی صالح جذبہ کے ساتھ اپنے مالک حقیقی سے جاملے، اسی روز آپ کی نماز جنازہ

حضرت مولانا محمد ناظم ندوی رئیس المعہد الاسلامی مانک مئو نے پڑھائی جس میں بے شمار لوگوں نے شرکت کی اور دین کے اس خادم کو آخری آرام گاہ تک پہنچایا، آپ کے حادثۂ وفات پر جامعہ اشرف العلوم رشیدی کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ صاحب نے شدید رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ حاجی صاحب کے انتقال سے میدانِ تصوف واصلاح کا ایک سچا خادم ہمیشہ کیلئے رخصت ہوگیا۔دین وملت کیلئے ان کی مخلصانہ خدمات کو ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

اللہ ان کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں جگہ مرحمت فرمائے اور مرحوم کے جملہ پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے آمین۔

اس کی امیدیں قلیل اور مقاصد جلیل

حضرت مولانا زبیر الحسن کاندھلویؒ

ملت اسلامیہ اس وقت شدید صدمہ سے دوچار ہوگئی جب اس کے فرزانوں اور توحید مستوں کی بپا کردہ نوے سالہ دینی وایمانی عالمی تحریک جماعتِ دعوت وتبلیغ کے بافیض امیر اور سرکردہ مذہبی رہنما حضرت مولانا زبیر الحسن کاندھلوی علیہ الرحمہ والرضوان نے دہلی کے رام منوہر لوہیا میں ۱۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ مطابق ۱۸/ مارچ ۲۰۱۴ء

بروز منگل کو اس دنیائے آب وگل سے منھ موڑ لیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا زبیر الحسن ادھر ایک عرصے سے لیور اور کڈنی کے عارضے میں مبتلا تھے ان کی تشویشناک علالت کے پیش نظر انہیں داخل اسپتال کیا گیا، علاج ومعالجے کی جملہ تدابیر روبہ عمل لائی گئیں، لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے اور قضاء وقدر کے اٹل فیصلہ پر لبیک کہتے ہوئے بالآخر انہوں نے اپنی جان جان آفریں کے حوالہ کر دی، تغمدہ اللہ بغفرانہ۔

مرگِ مجنوں پہ عقل گُم ہے میر   کیا دِوانے نے موت پائی ہے

مولانا زبیر الحسن کے سانحۂ رحلت کی خبر وحشت اثر جیسے ہی برقی میڈیا کے ذریعہ عام ہوئی تو ہر طرف سناٹا چھا گیا، فون پر فون بجنے لگے، ملک اور بیرون ملک جماعتی رفقاء، دعوتی احباب اور دین پسند حضرات جنہیں مذکورہ ایمانی تحریک کے عالم گیر انقلابی اثرات کی کسی بھی درجہ میں شدبد ہے مضطرب وبچین ہو اُٹھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ اضطراب فطری بھی تھا اور واجبی بھی کہ آخر مولانا مرحوم جماعت مذکور کے نظام دعوت وعمل کو اپنے اکابر اہل اللہ کے وضع کردہ خطوط پر نہ صرف استوار رکھنا چاہتے تھے بلکہ عملاً اس کیلئے تادم حیات سبک سار وکوشاں بھی رہے ؎

ہوا تھی گو تیز وتند لیکن چراغ اپنا جلا رہا تھا
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے تھے انداز خسروانہ

اللہ بزرگ وبرتر نے انہیں بے شمار اوصاف وکمالات سے آراستہ کیا تھا، وہ ایک ایسی دل آویز شخصیت کے مالک تھے جس میں علم وعمل، تقویٰ وطہارت، جود وسخا، صدق وصفا اور تواضع وخاکساری جیسے حسین اوصاف کا اجتماع معلوم ومشاہد ہوتا تھا۔ ظاہری وباطنی کمالات نے ان میں جامعیت کی شان پیدا کر دی تھی، وہ ایک عالم باعمل صوفی منش، جہاں دیدہ مبلغ اور خدا رسیدہ ترجمان اسلام تھے، ان کے حادثۂ وفات سے

عالم اسلام میں رنج والم کی لہر دوڑ گئی۔ ان کا انتقال کسی فرد واحد کی موت نہیں تھا اور نہ کسی خاندان کا ذاتی صدمہ، بلکہ ملت اسلامیہ کیلئے ایک ایسے آفتاب عالم تاب سے محرومی کی بات تھی جس کی ضوفشانی سے شرق وغرب اور شمال وجنوب منور تھا، جس کی چمک سے ایوان ظلمت وجہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے آن واحد میں کافور ہوجایا کرتے تھے۔ وہ اسلام کے عطا کردہ سنہرے اصولوں اور ضابطوں کی روشنی میں دعوت وتبلیغ کے فلسفہ کی تشریح وتفہیم کرتے تھے، ان میں نہ ادعائی مزاج تھا اور نہ تعلّی وتفاخر سے کوئی سروکار۔ زبان پر بے پناہ کنٹرول، بے ضرورت گفتگو سے مکمل احتراز اور غیبت وبدگوئی سے ہمہ وقت اجتناب۔ جماعتی نظام کو ان کے معتدل تجربات سے نہ صرف روشنی ملتی بلکہ وہ ہر لحظہ اس کے فروغ واستحکام کی ادھیڑبن میں متحرک نظر آتے تھے۔ اجتماعی مفادات کی برآری وبقا کے پیش نظر ذاتی حصولیابیوں سے صرف نظر کرلینا مرحوم کا وصف خاص تھا، وہ اپنی رائے دوسروں پر تھوپنے کے بالکل قائل نہیں تھے، بلکہ ان کی ہر جائز رائے وخواہش کا احترام لابدی جانتے تھے۔

داعی الی اللہ مولانا زبیر الحسن گلشنِ دعوت وتبلیغ کا ایسا گل سرسبد تھے جس کی مہک سے برصغیر ہی کیا دنیا کے دور دراز خطے بھی مشک بار تھے، یوں تو وہ مظاہر علوم سے رسمی فراغت کے معاً بعد اپنے نامور والد حضرت جی مولانا انعام الحسنؒ کے دست وبازو بن کر تبلیغی مشن کی آبیاری کررہے تھے، لیکن ۱۹۹۵ء میں جب حضرت جیؒ واصل بحق ہوگئے تو مقتدر علماء کرام نے مثلث شکل کا ایک عالمی شورائی نظام ترتیب دیا جو حضرت مولانا محمد سعد کاندھلوی اور حضرت الحاج عبدالوہاب پاکستانی پر مشتمل تھا، مولانا مرحوم اس سہ رکنی مجلس مشاورت کے مرکزی رہنما تھے۔ وہ جماعتوں کی روانگی کے وقت آداب سفر اور ضروری ہدایات دینے کے بھی مکلف تھے، علاوہ ازیں عالمی دعوتی تقاضوں کے ضمن میں

دنیا بھر کے متعدد ملکوں کے اسفار بھی کرتے تھے، ان کی دعاء اور زبان سادگی کے باوصف تاثیر سے پر ہوتی تھی، جس سے ان کا سوز دروں صاف جھلکتا تھا بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا اور شرک وبدعت کی زندگی سے تائب ہو کر صراط مستقیم پر گامزن ہوئے۔

مولانا زبیر الحسن کی ۱۰ر جمادی الثانی ۱۳۶۹ھ مطابق ۳۰ر مارچ ۱۹۵۰ء کو ولادت ہوئی۔ غوث زماں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ نے بسم اللہ کرائی قرآن پاک حفظ کیا، ابتدائی عربی، فارسی گھر پر رہتے ہوئے پڑھی ۱۵ر شوال ۱۳۵۸ھ۔ ۶ر فروری ۱۹۶۶ء کو مظاہر علوم سہارنپور میں متوسط کتابوں (شرح جامی وغیرہ) میں داخلہ لیا اور دورۂ حدیث تک تعلیم کی تکمیل کر کے ۱۳۹۰ء مطابق ۱۹۷۱ء میں سند فضیلت سے سرفراز ہوئے۔ آپ کے رفقاء درس میں حضرت مولانا وسیم احمد سنسار پوری شیخ الحدیث جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ اور حضرت مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری امین عام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ بعد ازاں برکۃ العصر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے بیعت ہوئے، آپ کے بتائے اوراد ووظائف اور معمولات پر کاربند رہتے ہوئے ۳ر ربیع الاول ۱۳۹۸ھ۔ ۱۰ر فروری ۱۹۷۸ء میں مدینہ منورہ کے اندر آپ سے اجازت وخلافت حاصل کی، آپنے اسی پر تکیہ نہیں کیا بلکہ سلوک ومعرفت کی راہوں کا کامیاب سفر جاری رہا تا آنکہ والد گرامی مرتبت حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلوی امیر ثالث۔ نیز مفکر اسلام حضرت سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی آپ کو خرقۂ خلافت سے نوازا۔ دریں اثناء مدرسہ کاشف العلوم دہلی میں آپ کا تقرر ہوا، جہاں آپنے درس نظامی کی چھوٹی بڑی اکثر کتب نہایت سلیقہ سے پڑھائیں۔

۲۵ر شوال المکرم ۱۳۸۸ھ۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۶۹ء میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کی نواسی دختر حکیم مولوی محمد الیاس سہارنپوریؒ سے آپ کا نکاح ہوا، جن سے تین

لڑکے، تین لڑکیاں کل چھ اولاد ہوئیں، صاحبزادگان میں مولانا زہیر الحسن مظاہری، مولوی صہیب الحسن مظاہری اور مولوی حافظ خبیب الحسن کاشفی ہیں بارک اللہ فی علمہم و عملہم۔ اللہ پاک ان سبھی کو اپنے والد بزرگ وار کا سچا وارث اور دین وملت کا خدمت گذار بنائے۔

بہرکیف اسی روز آپ کی نماز جنازہ سرپرست خاندان اور آپ کے روحانی مرشد حضرت مولانا مفتی افتخار الحسن کاندھلوی مدظلہ نے لاکھوں افراد کی موجودگی میں پڑھائی اور مرحوم مرکز نظام الدین دہلی کے مقبرۂ خاص میں اپنے والد ماجد کے پہلو میں آسودۂ خواب ہوئے

آسماں ان کی لحد پہ شبنم افشانی کرے — سبزۂ نورستہ وہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(بہ شکریہ ماہنامہ مظاہر علوم بابتہ ماہ مئی، جون ۲۰۱۴ء)

☆☆☆

وہ گلستانِ علم وادب کی بہار تھا

حضرت مولانا عظیم الدین انبہٹویؒ

۱۸ر شوال المکرم ۱۴۳۵ھ مطابق ۱۵ر اگست ۲۰۱۴ء بروز جمعہ صبح تقریبا سوا دس بجے جب کہ پورا ملک یوم آزادی کی روشن تقریبات سے جگمگا رہا تھا تو دفعتاً یہ خبر وحشت اثر نہایت غم واندوہ کے ساتھ سنی گئی کہ قصبہ انبہٹہ کی بافیض دینی وعلمی شخصیت اور عارف باللہ حضرت مولانا عظیم الدین صاحب کا ورق حیات بھی پلٹ گیا

ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مواصلات، سوشل میڈیا اور دیگر ذرائع سے اس خبر کے عام ہوتے ہی چاروں طرف سناٹا چھا گیا، حسرت والم کی تاریکی چہار سو پھیل گئی اور ہزاروں کی تعداد میں قریب وبعید میں پھیلے آپ کے عقیدت کیش ومتعارفین آخری رسومات کی ادائیگی میں شرکت کیلئے افتاں وخیزاں قصبہ امبہٹہ کی طرف پلائن کرتے نظر آئے، جہاں رجیل موصوف کے دم نفس سے آباد مدرسہ خلیلیہ کے صحن میں دین وملت کے اس مرد مجاہد کا جسد خاکی بھی عام زیارت کیلئے رکھا گیا تھا، عینی شاہدین کا بیان ہے کہ مجمع کی کثرت کے سبب مدرسہ کا صحن باوجود کشادگی کے تنگ دامانی کا شکوہ کر رہا تھا، بالآخر اسی روز بعد مغرب آپ کی نماز جنازہ دارالعلوم دیوبند کے ہردل عزیز استاذ اور صاحب نسبت عالم دین حضرت مولانا محمد سلمان بجنوری نقشبندی کی اقتدا میں ادا کی گئی جس میں دینی ودعوتی اداروں سے وابستہ ہزاروں افراد نے شرکت کر کے دین وادب کے اس بے لوث خادم کو آخری آرام گاہ تک پہنچایا جہاں امید ہے کہ رحمت ومغفرت کی دائمی سعادتیں انہیں ہر لحظہ میسر ہو رہی ہونگی ان شاء اللہ۔

کوئی شبہ نہیں کہ مولانا عظیم الدین امبہٹوی ان واصل باللہ نادرۂ روزگار ہستیوں میں نمایاں شناخت کے حامل تھے جو شہرت ونمود سے بے پرواہ ہو کر علم ومعرفت کی شمع روشن رکھتے ہیں۔ یہ خاصان خدا اپنے دم فیض سے روح وروحانیت کا ایسا اثر آفریں انقلاب لاتے ہیں کہ کفر وشرک اور خدا بیزاری کا لادینی نظام آن واحد میں زیر وزبر ہو کر خوشگوار دینی فضا میں تبدیل ہو جاتا ہے، ان کے وجود باجود سے نور ونکہت کی ایسی خوشبوئیں مہکتی ہیں کہ جس سے نہ صرف پورا ماحول زعفران زار ہو جاتا ہے بلکہ شاداب طبیعتیں بھی مسکرانے لگتی ہیں۔

مولانا عظیم الدین صاحب جس نگری کے پروردہ تھے اسے علم وکمال کی نامی

گرامی شخصیتوں سے انتساب کا درجہ حاصل رہا ہے۔ ایک زبدۃ المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد انبہٹویؒ ہی کیا متعدد افراد واشخاص ہیں جنہیں اس سرزمین کی کلاہ افتخار کے زریں ستاروں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہاں کی زرخیز مٹی سے علم وحکمت کے ایسے پتلے تیار ہوتے رہے ہیں جن کے نام اور کام نے سرزمین مذکور کے سنہرے کردار کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ اس کی چمک کو دوآتشہ کرنے میں بھی انہوں نے بساط بھر کوششیں صرف کیں ۔مولانا مرحوم کو بھی اس دور قحط الرجال میں یقیناً انہیں نمایاں افراد کے زمرہ میں ارادی طور پر شامل رکھا جائے گا۔

۲۹ رجون ۱۹۱۷ء کے اندر ایک دینی گھرانے میں آنکھیں کھولنے والے مولانا عظیم الدین نے ابتدائی تعلیم وتربیت وطن میں رہ کر حاصل کی، باقی تعلیم مختلف مقامات پر درجہ بدرجہ حاصل کرتے ہوئے ۱۹۳۹ء میں دارالعلوم دیوبند پہنچے جہاں کبار اساتذہ ومحدثین علم وادب کی مجلسیں سجائے بیٹھے تھے اور علم کے جویا یہاں آکر اپنا دامن مراد بھر رہے تھے، مولانا انبہٹوی نے یہاں جن بزرگوں سے اکتساب علم کیا ان میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ، امام المعقول حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مفسر قرآن حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ جیسے آفتاب وماہتاب خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔

علوم ظاہری سے کسی قدر تسکین ہوئی تو باطنی فیوض وبرکات سمیٹنے کیلئے قطب دوراں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت وارادت کا رشتہ استوار کیا جو مرشد کی زندگی کے آخری دم تک مستحکم انداز میں قائم رہا، آپ کے تجویز فرمودہ اوراد ووظائف پر زندگی بھر کاربند رہے اور اپنے ایک رفیق حضرت مولانا سید محمود پٹھیڑوی سے خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا، انجذاب الی اللہ اور یقین ومعرفت کی تحصیل مزید نے آپ

کو زندگی بھر بے چین کئے رکھا، چنانچہ عشق الٰہی کی انگیٹھی کو گرم رکھنے اور سلف کی اس امانتِ گراں مایہ کو دوسروں کے پاس پہنچانے کی فکر بدستور دامن گیر رہتی، اسی لئے بہت سے خوش نصیب تو آپ کے دامن فیض سے وابستہ ہو کر بامراد ہوئے۔

حضرت مولانا کی ذات والا صفات دین وملت کے روشن کارہائے نمایاں کا تابندہ عنوان تھی۔ وہ ایک داعی الی اللہ، روشن ضمیر عالم دین، خدا رسیدہ بزرگ، عبقری معلم اور مربی استاذ تھے۔ تعلیم وتربیت کے جملہ رسمی مراحل طے کرنے کے بعد ان کی عملی زندگی ایک کھلی کتاب کے مانند تھی جس کا ورق ورق درخشاں ہے، دین کے شعبوں میں ان کے یہاں تفریق روا نہیں تھی بلکہ دین کی راہ سے ہر مخلصانہ خدمت کو وہ دوسرے شعبہ کا تعاون گردانتے تھے۔ چنانچہ دعوت واصلاح، تبلیغ وتلقین، تذکیر وتقریر اور تدریس وتربیت کے میدان میں ان کے ذریعہ انجام دئے گئے مفید کارہائے نمایاں آب زلال سے لکھے جائیں گے اور وقت کا مورخ ومبصر جان بوجھ کر بھی ان کی خدمات سے صرف نظر نہ کر سکے گا۔

حضرت مولانا عظیم الدینؒ یوں تو متنوع اوصاف وکمالات کا حسین مجموعہ تھے۔ لیکن علم ومطالعہ سے قلبی وابستگی ان کی ذات کا ناقابل انفکاک حصہ تھی، اس خاکسار نے ان کے شوقِ علم وکتاب کے واقعات اس تواتر سے سنے کہ ان کی عظمت ومحبت کا سکہ دل پر بیٹھ گیا، ویسے بھی یہاں جامعہ اشرف العلوم رشیدی میں ہم جیسے ان کے بہت چھوٹے آپ کا ذکر خیر کر لیا کرتے تھے۔ زیارت واستفادہ کے جذبہ نے یاری کی تو سال گذشتہ ان کی قیام گاہ پر بھی حاضری ہوگئی، لیکن آپ کے حفید ذی احترام مولانا مسیح اللہ قاسمی نے بتایا کہ ادھر چند دنوں سے چونکہ علالت تشویشناک حد تک نازک ہوگئی ہے اس لئے گفتگو نہیں ہو سکے گی دیکھ کر اندازہ ہوا کہ واقعی ملاقات کی پوزیشن میں نہیں تھے، چنانچہ تبادلہ خیال کی راہیں اگرچہ مسدود تھیں مگر ان کے چہرہ بشرے سے ذکر وفکر اور نجابت وشرافت کے آثار

ہویدا تھے، لگتا تھا کہ نحیف ونزار جسم کا یہ انسان اب دنیوی جھمیلوں سے بالکل منقطع ہوکر بارگاہِ رب صمدیت میں اپنی مستجاب خدمات کا صلہ پانے کا اشتیاق رکھتا ہے، بالآخر ایکدن جب یہ خبر سننے کو ملی کہ حضرت مولانا عظیم الدین جوادھر ڈیڑھ سال کے طویل عرصہ سے علی شرف الرحیل تھے واصل بحق ہوگئے ہیں تو ان کا وہ سراپا یکایک نگاہوں کے سامنے ایک مرتبہ پھر آ کھڑا ہوا، جس سے افادات وفیضان کا ایک جہان روشن تھا۔ اللہ پاک آپ کے درجات بلند فرمائے، اعلی علیین میں جگہ دے اور رحمت ومغفرت کا ابر کرم آپ کے مرقد مبارک پر جھوم جھوم کر برستا رہے آمین۔

آسماں ان کی لحد پہ شبنم افشانی کرے   سبزۂ نورستہ وہ اس گھر کی نگہبانی کرے

علم دوست اور امانت دار تاجر

حضرت مولانا محمد یونس بنارسیؒ

ایک درجن سے زائد چھوٹی بڑی کتابوں کے مؤلف ومرتب اور شہر بنارس کے تاجر دوست حضرت مولانا محمد یونس بنارسی اپنی حیات مستعار کی ۷۱/ بہاریں دیکھ کر ۶/ ذی الحجہ ۱۴۳۵ھ مطابق ۲/ اکتوبر ۲۰۱۴ء بروز پنجشنبہ دوپہر کے تقریباً دو بجے اللہ کے

جوار میں چلے گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا بنارسی نے ۱۵ر صفرالمظفر ۱۳۶۴ھ میں شہر بنارس کے ایک متوسط دینی گھرانے میں آنکھیں کھولی، ابتدائی تعلیم وتربیت تا متوسطات وطن ہی میں رہ کر حاصل کی، بعد ازاں اپنے ایک دیرینہ رفیق اور دارالعلوم دیوبند کے موجودہ مہتمم حضرت مفتی ابوالقاسم نعمانی مدظلہ کی معیت میں دیوبند آئے اور چار سال وہاں تحصیل علم کا کامیاب سفر جاری رکھا، بالآخر ۱۹۶۵ء میں سند فراغ حاصل کی، بخاری شریف حضرت مولانا فخرالدین مرادآبادیؒ سے پڑھی، آپ کے دیگر اساتذہ میں حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیبؒ، حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مولانا فخرالحسنؒ، حضرت مولانا محمد حسین بہاریؒ اور حضرت مولانا نصیر احمد خاںؒ وغیرہم سرفہرست ہیں۔

آپ کا اصلاحی تعلق حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیبؒ سے رہا۔ آپ کی رحلت کے بعد شیخ المشائخ حضرت مولانا شاہ محمد احمد پرتاپگڈھیؒ کی طرف رجوع کیا، جب آپ بھی اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے تو پھر خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ سے وابستہ ہوگئے تھے۔

مولانا محمد یونس صاحب کا تعلق تدریس سے صرف واجبی سا رہا اور وہ بھی چند سال تک، البتہ لکھنے لکھانے کا نفیس ذوق رکھتے تھے، ان کی بعض کتابیں تو سینکڑوں صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں جن کے جمع وترتیب میں موصوف نے یقیناً خاراشگافی کی ہوگی، وہ مظاہر علوم وقف سہارنپور کی مجلس شوریٰ کے بھی رکن رہے۔ فقیہ الاسلام حضرت مفتی مظفر حسین قدس سرہ کی وصیت پر انہیں ورکنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا گیا تھا۔ مولانا مرحوم حق گوئی، معاملات کی صفائی، اور تقویٰ وطہارت جیسے گرانمایہ اوصاف وکمالات کا حسین مجموعہ تھے، جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ سے بھی آپ کو تعلق خاطر تھا، اور وہ زندگی بھر

جامعہ ہذا کے قدردان رہے، بہرکیف آپ کی نماز جنازہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا ابوالقاسم نعمانی نے پڑھائی، جس میں عوام وخواص کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی، اللہ پاک درجات بلند فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے آمین۔

دین وادب کے بےلوث خادم کا سفر آخرت

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ارشاد قاسمی ماجرویؒ

دیکھیے ابھی اور کتنے حادثے اس امت مرحومہ کے نصیبے میں لکھے ہیں، محرومیوں کے کتنے داغ ابھی اور سہنے ہیں، قحط الرجال کی شکایت تو زبان زد تھی ہی مگر کیا کیا جائے کہ جو بادہ کش پرانے تھے وہ بھی ایک ایک کر کے آخرت کو سدھار رہے ہیں، ان بافیض شخصیات کے دمادم اٹھ جانے سے محرومیوں کے بے شمار عنوانات نگاہوں کے سامنے اس طرح رقص کناں ہوتے ہیں کہ اشکوں کا امڈا سیلاب بھی روکے نہیں رکتا۔

گذشتہ ۱۸/ذی الحجہ ۱۴۳۵ھ مطابق ۱۳/اکتوبر ۲۰۱۴ء بروز پیر دین وادب کے بےلوث خادم اور مربی استاذ حضرت مولانا محمد ارشاد قاسمی بھی تقریباً ۷ رسال صاحب فراش رہ کر واصل بحق ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی　　　اسی پہ ضرب پڑی جو شجر پرانا تھا

مولانا ارشاد صاحب دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور مدرسہ کاشف العلوم چھٹمل پور کے اولین شیخ الحدیث ہونے کا بھی شرف رکھتے تھے، تین دہائیوں سے زائد عرصہ پر محیط طویل زمانہ تک انہوں نے مدرسہ کاشف العلوم میں تدریس کے فرائض بڑی نیک نامی سے انجام دیے اور درس نظامی کی بیشتر چھوٹی بڑی کتب نہایت سلیقہ سے پڑھائی۔ مولانا

مرحوم شہرت و ناموری کے لحاظ سے تو کوئی خاص علاقہ نہیں رکھتے تھے لیکن اگر علم و افادہ کی غیر معمولی ترسیل و تبلیغ کو معیار قبولیت کی سند دی جائے تو پھر حضرت مولانا کو بھی ان معدودِ چند بافیض علمی افراد کے زمرہ میں شامل رکھا جائے گا جن سے کاروان علم و تحقیق اور خدام درس و تدریس کو روشنی ملتی رہی ہے۔

مولانا مرحوم کے متعارفین اور شناسا حضرات بخوبی واقف ہیں کہ ان کی پوری زندگی سرد و گرم احوال سے عبارت تھی، انہوں نے ضلع سہارنپور کے ایک مضافاتی گاؤں نائی ننگلی عرف ماجری میں جناب محمد ابراہیم صاحبؒ کے ہاں اس حال میں آنکھیں کھولی کہ غربت و افلاس کی ہر سو حکمرانی تھی، زندگی کا گذر بسر بمشکل تمام ہوتا تھا، لیکن مولوی صاحب موصوف نے قلم و کتاب ہی سے رشتہ استوار کرنے کو ترجیح دی، تقریباً بارہ سال کی عمر میں کلام پاک حفظ کیا، والد صاحب نے گھریلو مجبوریوں کے مدنظر آبائی پیشہ یعنی زراعت اختیار کرنے کی ترغیب دی مگر موصوف اس کے لئے تیار نہ ہوئے اور تعلیمی اشتغال رکھا، اسلام پور بھیسانی اور جلال آباد کے مدرسوں میں آپ کا تعلیمی سفر جاری رہا جس کے جملہ اخراجات مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خان علیہ الرحمہ برداشت کرتے تھے۔ مذکورہ مقامات پر سات سال تک تحصیل علم کا سفر جاری رکھنے کے بعد بالآخر دارالعلوم دیوبند پہنچے اور سند فضیلت حاصل کی۔ آپ کا سن فراغ ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء ہے۔ بچپن ہی سے نماز تہجد کے اہتمام اور ذکر و فکر کے فطری ذوق نے روح و روحانیت کے میدان میں پیش قدمی کی راہ ہموار کی اور رام پور کی روحانی شخصیت حضرت الحاج محمد عاشق الٰہیؒ کے دربار تصوف میں خرقۂ خلافت سے سرفراز کئے گئے۔ مولانا مرحوم صاحب فضل و کمال ہونے باوجود تواضع و انکساری کا اعلیٰ نمونہ تھے، ان کی وضع قطع اور لباس و وضع داری سے ایک ایسی معصوم شخصیت کا تصور ابھرتا تھا جس کی ہر رگ میں حمیت اسلامی کا لہو

گردش کرتا ہو۔ بلا شبہ وہ سلف کی بہترین یادگار تھے۔ دارالعلوم کی سند حاصل کرنے کے بعد انہیں ملازمت کے ایسے مواقع بھی میسر آئے جہاں اقتصادی اعتبار سے وہ خاصے کفیل ہو سکتے تھے مگر ان کے تعلیمی وتدریسی رجحان نے ان مادی خواہشات کو زیر کئے رکھا اور وہ اپنے وطن ماجری سے تقریباً ۵۳ رکلومیٹر دور چھتمل پور کے مدرسہ کاشف العلوم سے وابستہ ہو گئے، جہاں کے اسفار وہ اکثر اپنی سائکل کے ذریعہ کرتے۔

رب دوجہاں نے انہیں بڑی خوبیوں سے نوازا تھا، قرآن پاک کے بہترین حافظ تھے ۵۲ رسال تک کلام پاک تراویح میں سناتے رہے صرف تین دن کے اندر قرآن ختم کرنے کا معمول تھا، قرآن پاک سے عاشقانہ تعلق تھا اسی لئے بچپن میں ہر روز پندرہ پارے پڑھ لیا کرتے تھے، علاوہ ازیں ذکر وفکر اور سحر خیزی پر بھی دوام حاصل تھا ،حضرت مولانا محمد ناظم ندوی کا بیان ہے کہ مولانا موصوف دن میں چھٹی کے اوقات میں گھڑی سازی کا کام کرتے اور رات بھر مطالعہ کا اہتمام رکھتے تھے۔

الغرض صبر وشکر، تسلیم ورضا اور قناعت وتوکل جیسے اوصاف وکمالات سے آراستہ گوناگوں خوبیوں کا یہ انسان اس دار فانی سے اس طرح رخصت ہوا کہ چمن کاشفی کی باقی ماندہ علمی بہاریں بھی بے کیف سی ہو کر رہ گئیں، جس قدر خاموشی کے ساتھ مرحوم نے دین وادب کے پھریرے اڑائے تھے اس سے کہیں زیادہ سکون وگمنامی کے ساتھ وہ اپنے رب کا یہ مژدۂ جانفزا سن کر سفر آخرت پر روانہ ہو گئے جس کی تعبیر قرآنی یہ ہے:

یا ایتھا النفس المطمئنہ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔

آسماں ان کی لحد پہ شبنم افشانی کرے

مردِ آگاہ وحق شناس

حضرت مولانا محمد اسماعیل منوبریؒ

ابھی اسلامی کیلنڈر ۱۴۳۶ھ کا نیا سال شروع ہوا ہی تھا کہ پہلے قمری مہینہ کی ۱۶؍تاریخ بمطابق ۱۰؍نومبر ۲۰۱۴ء بروز دوشنبہ کو ظہر وعصر کے مابین ریاست گجرات کے مشہور بزرگ عالم دین اور دارالعلوم کنتھاریہ بھروچ کے مہتمم حضرت مولانا محمد اسماعیل منوبری اپنی حیات عزیز کی ۸۵؍سے زائد بہاریں دیکھ کر اللہ کے جوار میں چلے گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، ان للہ ما اعطی ولہ ما اخذ و کل عندہ بمقدار۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل منوبری ریاست گجرات کے ان بافیض علمائے حق میں نمایاں شناخت کے حامل تھے جن کی دینی وعلمی جدوجہد سے جہالت وضلالت کے دبیز پردے چاک ہوئے، بنابریں ایمان وعقائد کی دولت سے محروم کتنے ہی حق کے متلاشیوں کو جادۂ مستقیم پر چلنے کی تحریک ہوئی اور وہ صراط حق پر گامزن ہوسکے۔

مولانا مرحوم مردِ آگاہ وحق شناس اور ایمانی کیفیات سے مالا مال اثر آفریں شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ضلع بھروچ کے ایک گاؤں منوبر میں ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے ،ضروری مکتبی تعلیم کے بعد گجرات کی ایک دینی درسگاہ جامعہ حسینیہ راندیر میں تعلیمی مراحل طے کئے اور ۱۹۵۱ء میں سند فراغ حاصل کی۔ بعد ازاں اپنی عملی جدوجہد کا آغاز گاؤں ہی کے ایک مکتب سے شروع کیا، کچھ عرصہ بعد دارالعلوم کنتھاریہ میں جزوقتی خدمت کا بارگراں بھی اٹھایا، پھر ۱۹۷۱ء میں برطانیہ عازم سفر ہوئے اور وہاں بسلسلۂ خدمتِ تدریس وخطابت اور امامت کچھ سال گذار کر ۱۹۷۹ء میں واپس تشریف لے آئے اور پھر دارالعلوم

کنتھاریہ کی توسیع وترقی کچھ اس فداکاری کے ساتھ فرمائی کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ ادارہ ایک عالیشان دینی قلعہ کی صورت اختیار کرگیا، مولانا مرحوم نے تین دہائیوں سے زائد عرصہ تک مذکورہ مدرسہ کی ادارت کا فریضہ نہایت خوش اسلوبی سے نبھایا اور بے پناہ مجاہدات برداشت کئے جس کے فوائد وثمرات انہیں عنداللہ حاصل ہورہے ہونگے ان شاء اللہ۔ بالآخر آپ کی نماز جنازہ صاحبزادۂ محترم مولانا مفتی عبدالصمد صاحب نے پڑھائی جس میں ہزاروں افراد نے شرکت فرمائی، دریں اثنا حضرت رئیس الجامعہ نے حضرت مرحوم کے سانحہ وفات پر اپنے شدید رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے جملہ پسماندگان سے تعزیت مسنونہ پیش فرمائی، اللہ پاک مغفرت فرمائے اور درجاتِ کاملہ نصیب فرمائے آمین۔

(بہ شکریہ ماہنامہ صدائے حق گنگوہ)

وہی چراغ بجھا جس کی لَو قیامت تھی

حضرت مولانا محمد کامل صاحب علیہ الرحمہ

گذشتہ ۱۵ ربیع الاول ۱۴۳۶ھ مطابق ۷ جنوری ۲۰۱۵ء چہار شنبہ کو ہمارے اس زرخیز دوآبے کی بافیض اور بساغنیمت شخصیت عارف باللہ حضرت مولانا محمد کامل علیہ الرحمہ نے کیا آنکھیں موندیں، علم وفضل، تواضع وانکساری اور دانش وبینش کے ایک جہان نے آنکھیں موندلی، انا للہ وانا الیہ راجعون ○ اللھم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ وامطر علیہ شآبیب رحمتک ونقہ من الذنوب کما ینقی الثوب الابیض من الدنس۔

حضرت مولانا مرحوم دین ودانش اور تعمیر ملک وملت کے باب میں اپنے روشن کارہائے نمایاں کے سبب خاصے شہرت پذیر واقع ہوئے تھے، حالانکہ ہر قسم کے صلہ وستائش سے بالکل بے فکر ہوکر نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے کام سے کام رکھنا اور بڑے بڑے دینی معرکے سر کرنا موصوف کا وصف خاص تھا، اسی لئے ارادی طور پر بھی انہیں شہرت ونمود سے خدا واسطے کا بیر تھا اور وہ اسے مقاصد زندگی سے خارج از امکان حظ نفس کا بس ایک کھلونا گردانتے تھے، مگر دستِ قدرت کی مہربانی کہ عزت ونیک نامی نے ہر جگہ ان کے قدموں کو بوسہ ہی دیا اور وہ افادۂ دین وملت کے ہر محاذ پر کامیابی سے ہم عناں نظر آئے جو ظاہر ہے کہ نصرتِ خداوندی کی شمولیت کے بغیر استطاعتِ انسانی سے پرے کی بات ہے۔

مولانا مرحوم کی ذات والا صفات طالبانِ رشد وہدایت کیلئے بھی منارۂ نور اور مربی کی حیثیت رکھتی تھی، ان کی حکایات ہستی کا ہر ورق درخشاں اور خادمانِ دین وملت کیلئے مانندِ روح افزا ہے۔ وہ اللہ بزرگ وبرتر کے ان مقربین میں سے ایک تھے جن کی کتاب زندگی کے ہر صفحہ پر عزم واستقامت، اخلاص ووفا، عفت وشجاعت اور سخاوت وکمالات کی ان گنت داستانیں ہی مرقوم نظر آئیں گی۔ آج ان کا خلا بہت شدت سے محسوس ہورہا ہے۔ اخبارات ورسائل ان کی رحلت پر ماتم کناں ہیں، دینی ادارے اور ملی جماعتیں اپنے اس محسن کے داغ مفارقت سے یاس والم کی تصویر بنے ہوئے ہیں، مجالس وخانقاہیں اس صاحب ارشاد بزرگ کے اٹھ جانے سے بے کیف سی ہوگئیں ہیں اور آج پھر وہی شعر ذہن کی اسکرین پر بار بار گردش کررہا ہے کہ ؏

حیف ہے وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگار رونق محفل تھی پروانے کی خاک

زمانہ پہلے بھی بہتوں کو رویا ہے، اس نے بار ہا پہلے بھی اپنے کتنے ہی چہیتوں کو پیوند خاک ہوتے دیکھا ہے، کیا رازی وغزالی اور کیا شبلی وجنید اپنی اپنی زندگی کا مقدور بھر کام کر کے سبھی منوں مٹی کے نیچے تا قیام قیامت اس طرح محوخواب ہیں کہ آسمان ان پر شبنم افشانی کر رہا ہے تو موجودین ان کیلئے مستجاب سرگوشیوں میں مگن، ظاہر ہے کہ پسِ مرگ بھی حسنات کا یہ ایجابی سلسلہ ہر کس و نا کس کا مقدر نہیں بنتا خود اس تیرۂ خاک دان میں اقبال مندی یونہی کسی کا نصیبہ نہیں بنتا اور محبوبیت کا تاج بلا وجہ کسی کے سر پر نہیں سجتا، بلکہ حق جل مجدہ خاصان خدا کے انتخاب پر مہر لگاتا ہے تب جا کر مولانا کامل صاحب جیسے دھن کے پکے اور لگن کے سچے اس دنیائے آب و گل میں آنکھیں کھولتے ہیں ع

مت سہل جانو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

یادش بخیر! دو سال قبل جامعہ اشرف العلوم رشیدی کے شعبۂ تجوید وقرأت کے مشاق استاذ جناب قاری محمد طالب ہریانوی کی رفاقت میں ان کے دولت کدہ پر حاضری ہوئی، علیک سلیک اور تعارف ہوتے ہی مہربان ہو گئے، جامعہ اشرف العلوم رشیدی اور اس کے ارباب بست وکشاد کی خیر خیریت محبت بھرے انداز دریافت فرمائی جس سے محسوس ہوا کہ گنگوہ سے انہیں والہانہ الفت ہے، ہمت افزائی کے طور پر کہنے لگے کہ ماہنامہ ''صدائے حق'' ماشاء اللہ پابندی سے دستیاب ہو رہا ہے، استفادہ بھی کرتا ہوں ،اس کے محتویات قابل مطالعہ ہوتے ہیں، بلکہ یہ خاکسار تو اس وقت شرم سے پانی پانی ہو گیا، جب انہوں نے یہ خواہش ظاہر فرمائی کہ میں ان کے ادارے جامعہ بدر العلوم گڈھی دولت کے بعض اساتذہ سے اس کے مقاصد میں شامل رسالہ کے اجراء سے متعلق ازراہ مشورہ کچھ مفید گفتگو کروں، بہر حال یہ بھی ان کی ذرہ نوازی ہی تھی ورنہ ''من آنم کہ من

دائم"۔

حضرت مرحوم سے شرفِ ملاقات کا یہ پہلا اور آخری موقع تھا جب ان کی مقناطیسی شخصیت نے اس ناچیز کو آہن پاروں کی طرح اپنے کمالات کا اسیر بنا کر چھوڑا، اسی وقت اندازہ ہوا کہ مولانا مرحوم کے اندر کا انسان بے حد حساس اور ہمہ جہت فضائل وکمالات کا خوب صورت مجموعہ ہے جس کے رگ وپے میں انسانیت نوازی، غم خواری وغمگساری اور ہمدردی وخاکساری کے کتنے ہی آبشار رواں دواں ہیں، کسی نے سچ ہی کہا ہے:

فرشتوں سے بڑھ کر ہے انسان بننا مگر اس میں ہوتی ہے محنت زیادہ

یہ بھی دراصل ان کی کسبی محنتوں اور مجاہدات شاقہ کے ساتھ ساتھ والدین کی مقبول دعاؤں اور اپنے اساتذۂ ذیشان کی خدمت ومحبت کا لابدی نتیجہ وثمرہ تھا، بھلا جس کے اساتذۂ کبار میں شیخ التفسیر مولانا محمد ادریس کاندھلوی بطور مشیر علمی دستگیری کر رہے ہوں، حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب اور حضرت مولانا افتخار الحسن کاندھلوی جیسے مردان باصفا سیرت وکردار کے بنانے میں بنیادی رول نبھا رہے ہوں اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ جیسا پیر ومرشد سلوک ومعرفت اور بخاری شریف کی تدریس سے جسے فیض یاب کر رہا ہو، تو پھر اس خوش نصیب انسان کا مقدر کیوں نہ جاگے گا؟ اور اس کے ظاہر وباطن پر ان کیفیات کا کیا کچھ اثر نہ ہوا ہوگا، اسے آسانی سے دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ اسی لئے جب مولانا محمد کامل دارالعلوم دیوبند میں اپنی مابقیہ تعلیم کے پانچ سال مکمل کر کے ۱۹۵۲ء میں سندِ فضیلت سے نوازے گئے تو انہیں اپنی عملی زندگی کے نقوش وخطوط مرتب کرنے میں کسی پس وپیش کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ اپنے بڑوں سے مربوط رہ کر تادمِ واپسیں خدمت دین کیلئے وقف ہوگئے۔ ۱۹۳۳ء میں مردم خیز قصبہ

کاندھلہ کے اندر جنم لینے والے مولانا محمد کامل صاحب نے اپنی حیات عزیز کی ۸۲ر بہاریں دیکھیں اس درمیان انہوں نے نوع بنوع دین وملت کی نمایاں خدمات انجام دیں لیکن ان کی شناخت کا سب سے معتبر حوالہ ضلع شاملی کا مشہور وبافیض دینی مدرسہ جامعہ بدرالعلوم گڈھی دولت ہے جس کی ۱۹۶۷ء سے توسیع وترقی مولانا مرحوم کی جہد مسلسل کا روشن عنوان ہے اور جہاں فی الوقت دورۂ حدیث تک تعلیمی نظام بحمداللہ جاری وساری ہے، یقیناً مرحوم کیلئے بھی یہ بہترین صدقہ جاریہ ہے جس کی ادارت ونظامت کے فرائض آپ ہی کے خلف الرشید اور فرزند والا صفات حضرت مولانا محمد عاقل صاحب زید مجدہم باحسن وجوہ ادا فرمارہے ہیں، جو اپنے والد گرامی کے ان کے حین حیات ہی دست وبازو بن کر قافلۂ علم وکمال کی رہنمائی فرمارہے تھے۔ بس دعا ہے کہ اللہ پاک حضرت مرحوم کی مغفرت کاملہ فرمائے اعلیٰ علیین میں جگہ دے، جملہ پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی فرمائے اور آپ کے گلشن جامعہ بدرالعلوم کو قیامت تک کیلئے شاداب وآباد رکھے آمین۔

(بہ شکریہ روزنامہ ہندوستان ایکسپریس دہلی)

تعارف صاحبِ کتاب

علم، قلم اور اخلاق کی تثلیث:

محمد ساجد قاسمی کھجناوری

ازقلم: مولانا ڈاکٹر فاروقِ اعظم قاسمی

نزیل جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی

میں ۱۹۹۹ء کے بالکل اخیر میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا، فضیلت کے پہلے سال میں داخلہ ہوا، مضمون نگاری کا شوق بھی اسی وقت سے بیدار ہونے لگا، اب کا تو علم نہیں، اس وقت فضیلت کے ابتدائی دوسال تک رٹنے اور کتابوں کے حفظ کرنے کا رواج تھا اور امتحان بھی تحریری کی بجائے تقریری ہوا کرتے تھے، چونکہ حفظ وقرأت سے فراغت کے بعد میں دیوبند آیا تھا اس لیے دیگر ہم درسوں کے مقابلے میرے اندر سمجھداری زیادہ تھی، درسیات کے علاوہ خارجی مطالعات میں بھی دل چسپی پیدا ہونے لگی تھی اور دھیرے دھیرے اس میں ترقی بھی ہورہی تھی، لیکن ابتدائی دوسال کی درسی مصروفیات ان سرگرمیوں میں پڑنے سے مانع رہیں، تاہم دوسرے سال کے اخیر میں اپنی انجمن ''تہذیب البیان'' متحدہ مونگیر بہار کے سالانہ مسابقۂ مضمون نگاری میں شرکت کا موقع ملا اور یوں میری مضمون نگاری کا سفر شروع ہوا۔

اب تیسرے سال کی ابتدا تھی، درسیات کی مصروفیات سے قدرے آزادی ملی، اب رٹنے کا سلسلہ بہت کم رہ گیا تھا جو میرے لیے بڑی خوشی کی بات تھی، البتہ امتحانات اب بھی کچھ تقریری ہونے تھے، اب خارجی مطالعہ میں ذرا اضافہ ہوا، محنت ومشق جاری رہی، سال کے اختتام پر کل دارالعلوم کی مشترکہ انجمن ''مدنی دارالمطالعہ'' کے تحریری مسابقے میں شرکت کا موقع میسر آیا، موضوع ''مذہب اسلام امن عالم کا علمبردار'' تھا، مضمون بارہ صفحات پر مشتمل تھا اور وسعت بھر کاوش ومحنت سے تیار کیا گیا تھا، پوزیشن کوئی نہیں آئی ساتھ ہی مایوسی کو بھی اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا، پھر اسی مضمون کو میں نے ماہنامہ

"دارالعلوم" کے حوالہ کردیا، بفضل الٰہی نومبر ۲۰۰۲ء میں پہلے نمبر پر اسے جگہ ملی۔

ایک روز میں مطبخ کے قریب کھڑا غالباً کسی کا انتظار کررہا تھا کہ یکایک ایک دبلا پتلا طالب علم میرے سامنے نمودار ہوا، السلام علیکم۔ وعلیکم السلام۔ خیریت سے ہیں؟ جی اللہ کا فضل ہے۔ جی وہ رسالہ چاہیے تھا۔ میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا، کون سا؟ جس میں آپ کا مضمون چھپا ہے، میں اسے پڑھنا چاہتا ہوں۔

اسی طالب علم کو آج لوگ مفتی محمد ساجد قاسمی کھجناوری سے جانتے اور پہچانتے ہیں، ویسے ہم حلقۂ احباب انہیں محبت میں قاری محمد ساجد کھجناوری سے پکارا کرتے تھے اور اس لیے بھی کہ انہوں نے دارالعلوم میں سب سے پہلے تجوید وقرأت ہی میں اختصاص پیدا کیا تھا۔ یہ ہماری دوستی کی پہلی کڑی تھی۔ کھجناور ضلع سہارنپور کی ایک تاریخی بستی ہے جسے اکابر علماء اور مشاہیر کی خدمات وتوجہات کی مرکزیت حاصل رہی ہے۔ مولانا محمد ساجد ہی کی پر خلوص دعوت پر راقم کو بھی اس بستی کی سیاحت کا موقع ملا ہے۔ میرے ابتدائی سالوں کے ایک ہم درس مولانا فتح محمد ندوی بھی اسی گاؤں کے رہنے والے ہیں، مولانا محمد ساجد کی رفاقت میں ان کا بھی حصہ ہے۔ پتہ نہیں میری زبان پر کبھی نہ تو قاری ساجد فٹ بیٹھا اور نہ ہی لفظ "مفتی"۔ میری زبان پر تو بلا ساختہ "مولانا ساجد" آجاتا ہے اور وزن ووقار بھی مجھے اسی لفظ میں محسوس ہوتا ہے۔

اس کے بعد شدہ شدہ ہماری ملاقاتیں دوستی میں تبدیل ہوگئیں اور درسیات کے علاوہ دیگر کتابوں کے مطالعے اور مضمون نگاری جیسی دوسری سرگرمیوں میں ہم دونوں ایک ساتھ مشغول رہنے لگے، باہمی مباحثے اور رائے مشورے بھی ہوتے رہے۔ بھائی میں اس موضوع پر لکھ رہا ہوں، جناب آپ کا مضمون فلاں رسالے یا روزنامے میں شائع ہوا، مبارک ہو، بھائی، آپ کو اس موضوع پر قلم اٹھانا چاہیے، فلاں کا مضمون بڑا عمدہ تھا، ہاں

بھائی فلاں نے بڑا سرسری مضمون لکھا ہے، اس طرح کی گفتگو ہمارے بیچ ہوتی رہتی تھی اور یہ پروگرام بعد عصر چلتے پھرتے ہوا کرتے تھے، ایک مدت تک ہم دونوں کا یہ معمول رہا کہ ہم دارالعلوم دیوبند کی شمالی جانب سبز کھیتوں کی طرف برائے تفریح نکل جاتے اور مغرب تک آپس میں ورسی، دینی، علمی، سیاسی اور ادبی موضوع پر گفتگو ہوتی رہتی، اسی چلتی پھرتی اسمبلی میں ''مرکز نوائے قلم'' کا خاکہ تیار ہوا تھا جسے امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے حفید ذی احترام مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کے ایوان سے منظوری ملی تھی اور ہنوز یہ مرکز مولانا ہی کی زیر نگرانی اپنی قلمی وادبی خوشبو بکھیرنے میں مصروف کار ہے۔ تعلیمی لحاظ سے میں مولانا محمد ساجد قاسمی سے صرف ایک سال آگے تھا، ہم نوالہ تو نہیں ہم پیالہ ضرور تھے یعنی شام کی چائے نوشی بیشتر ایک ساتھ ہوتی تھی۔ میں دیوبند ۲۰۰۹ء تک زیر تعلیم رہا اور مولانا محمد ساجد فضیلت کے فوراً بعد مظاہر علوم سہارنپور روانہ ہوگئے اور شعبۂ افتاء سے منسلک ہوکر ۲۰۰۹ء میں تخصص فی الفقہ کی سند حاصل کی، پھر میں عصری علوم کی غرض سے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی آگیا اور وہ گنگوہ کے شہرت پذیر تعلیمی وتربیتی مرکز جامعہ اشرف العلوم کی مسند تدریس پر متمکن ہوگئے۔

انتہائی بے ضرر، اپنے کام سے کام، سیدھے سادے، بے تصنع، الفی قد، چہرہ قدرے لمبا، شکل وشباہت قابل قبول، ڈھیلا ڈھالا سفید لباس، گول ٹوپی اور نگاہوں سے چھلکتی سنجیدگی مولانا محمد ساجد کی پہچان ہے۔ علم کے ساتھ قلم کی دولت اور اخلاق کی خوشبو باہم دیگر ہو جائیں تو اس سے ایک عظیم انسان جنم لیتا ہے جو دولت لٹا کر بھی باثروت رہتا ہے اور اس کی خوشبو وروشنی خرچ کرنے سے بھی کبھی گھٹتی نہیں، مولانا محمد ساجد کی ذات میں یہ تثلیث وحدت بن گئی ہے۔

دارالعلوم میں یہ بات بہت مشہور تھی کہ سہارنپور اور مظفر نگر کے طلبہ ہر میدان کے

ماہر ہوتے ہیں سوائے پڑھنے لکھنے کے، لیکن میرے نزدیک اس کلیے میں حقیقت کم اور بناوٹ زیادہ ہے۔ پھر اچھے برے لوگ ہر خطے میں پائے جاتے ہیں، قیاس استقرائی سے نتائج برآمد کرنا خلاف انصاف ہے، میں نہ ماضی کی بات کر رہا ہوں اور نہ ہی مستقبل کی، میں تو صرف اپنے دس سالہ قیام دیوبند کے تجربات کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان دونوں اضلاع کے میرے جتنے بھی دوست وہم درس تھے ایک آدھ کو چھوڑ کر سب کے سب نیک طبیعت، نماز و درس کے پابند، غیر اخلاقی مشاغل سے دور، با اخلاق، خندہ ذہن اور کام سے کام رکھنے والے تھے۔ آج بھی عبدالصمد، شاہنواز، تعظیم، سالم اور نفیس و بابر وغیرہ کی باتیں اور باوقار ملاقاتیں ذہن و دماغ میں تازہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد ساجد کی سنجیدگی، محنت و لگن اور لکھنے پڑھنے کا شوق و جنون میرے لئے باعث کشش ہوا اور میرا ان سے دوستانہ قائم ہوا۔ مولانا محمد ساجد کی نام پر کم اور کام پر زیادہ توجہ ہوتی ہے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ زمانۂ طالب علمی ہی میں جب مظفر آباد کے مولانا مسعود عزیزی ندوی کو ایک ماہنامہ نکالنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو مولانا محمد ساجد نے اس سلسلے میں جس قدر تگ و دو اور خلوص و لگن کا مظاہرہ کیا وہ مولانا عزیزی سب دن یاد رکھیں گے، ملک بھر کے مشاہیر علماء سے رابطہ کر کے ان کی تائیدات و فرمودات اور پیغامات کے ساتھ ساتھ مقالات کی یکجائی کوئی معمولی کام نہیں تھا، جب تک مولانا محمد ساجد اس رسالے "نقوش اسلام" سے وابستہ رہے پورے خلوص و امانتداری سے اس کی تعمیر و ترقی کی لیے جد و جہد کرتے رہے۔

اسی طرح ان کے ایک ہم درس مولانا انور امرتسری کو جب تنظیمی سلسلے میں کچھ کرنے کا ارادہ ہوا تو وہاں بھی مولانا محمد ساجد نے اہم رول ادا کیا، بے صلہ و ستائش کے ملک بھر کے مشاہیر، ذمہ داران اور دینی و ادبی رسائل کے مدیران سے رابطہ کر کے ان سے علمی و قلمی اور رسالہ جاتی تعاون کی راہ ہموار کی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اللہ نے ان کے

قلم میں ایسی تاثیر رکھی ہے کہ لوگ پڑھتے ہی رہ جاتے ہیں اور انداز ایسا گویا ایک طویل تجربات سے گذرا ہوا ایک سنجیدہ اور مشاق قلم کار ہو۔ مولانا محمد ساجد نے اپنے تعلیمی سفر کے ساتھ مضمون نگاری کی مشق بھی مستقل جاری رکھی ، وہ دیوبند کے زمانۂ طالب علمی ہی سے ملک کے مؤقر اخبارات ورسائل میں شائع ہونے لگے تھے اور درجنوں علمی ، دینی ، سیاسی اور ادبی مضامین ان کے گہربار قلم سے نکلے جنہیں اہل علم نے تحسین کی نگاہ سے دیکھا، اس وقت بھی وہ اپنی صحافتی سفر کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور ماہنامہ ''صدائے حق'' گنگوہ ان کی ادارتی کوششوں سے فیضیاب ہو رہا ہے ،فقہ اور ادب عربی کی تدریسی خدمات کے ساتھ قلمی کاوشیں بھی جاری ہیں۔

مولانا محمد ساجد قاسمی جدید وقدیم روایت کا آمیزہ ہیں ،قدیم لٹریچر اور متاخرین علماء وادبا کا اسلوب وہ ضرور اختیار کرتے ہیں ،لیکن یہ ادا ان کو حال سے مربوط رکھتی ہے۔ اسی طرح حال کی مکمل تازگی بھی ان کی تحریروں میں موجود ہے مگر یہ وصف ان کی تحریر سے وزن ووقار کو ختم نہیں کرتا۔ مولانا حشو وزوائد سے گریزاں اور اختصار وجامعیت پر توجہ زیادہ مرکوز رکھتے ہیں اور بڑے نپے تلے انداز میں کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں۔ مدارس کے موجودہ عمومی لب ولہجے میں مولانا محمد ساجد کا اسلوب ممتاز ہے، ان کے زیادہ تر مضامین اسلامی ، اصلاحی ، سیاسی اور دعوتی موضوعات پر ہوتے ہیں لیکن ادبی حوالے سے اگر گفتگو کی جائے تو خاکہ نویسی میں مولانا کو خصوصیت حاصل ہے اور خاکوں کے ذریعہ انہوں نے تین درجن سے زائد اشخاص کے علم وفن کو اپنے قلم کی سلامی دی ہے۔ مولانا محمد ساجد قاسمی کا سب سے متاثر کن وصف اپنی ذمہ داریوں کے تئیں خلوص دیانت اور غایت انہماک ہے۔ ابھی گزشتہ دو سال قبل انہیں ماہر تعلیم مولانا قاری شریف احمد گنگوہیؒ کی حیات وخدمات پر ایک کتاب مرتب کرنے کی ذمہ داری سپرد ہوئی تو یقین جانیے کہ مولانا

نے محنت وخلوص کا اس قدر مظاہرہ کیا اور کیسے کیسے اصحاب لوح وقلم کو آمادہ ' تحریر کرلیا کہ قاری شریف احمد مرحوم کے نقوش و آثار کا ایک اچھا خاصا انسائیکلوپیڈیا بنام ''نقوش دوام'' تیار ہوگیا۔

دیوبند، دہلی، لکھنؤ، سہارنپور اور آگرہ وغیرہ کے درجنوں ادبی، نیم ادبی اور دینی رسائل وجرائد اور ساتھ ہی قومی علاقائی روزنامے مولانا محمد ساجد قاسمی کے قلمی محورر ہے ہیں ۔مولانا محمد ساجد قاسمی کی شخصی خوبیوں اور قلمی سرگرمیوں کا اعتراف تحریری انداز میں اس سے قبل بھی کیا جاچکا ہے۔ مولانا نایاب حسن قاسمی نے اپنی کتاب ''دارالعلوم دیوبند کا صحافتی منظرنامہ'' میں مولانا کا مختصر تعارف اور قلمی فتوحات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اسی طرح انور رایوبی گنگوہی صاحب نے بھی ان کے علم وقلم کو موضوع تحریر بنایا ہے۔

یہ چند آڑے ترچھے حروف والفاظ ماضی کی یادوں سے وابستہ ہیں امید کہ کسی کام کے ہوجائیں، خدا مولانا کے علم وعمل میں برکت، عزم وحوصلہ میں حرارت اور زبان وقلم میں حق گوئی وجرأت پیدا کر کے انسانیت اور دین متین کی عظیم خدمات لے لے آمین۔

(بہ شکریہ روزنامہ صحافت اردو دہلی ۱۵ر مارچ ۲۰۱۵ء)